نئی فردِ قرارداد جُرم

مولانا امین احسن اصلاحی

رسالہ الفرقان (لکھنؤ) بابت ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۳۷۰ھ میں ہمارے مخدوم دوست مولانا محمد منظور نعمانی نے "جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون تحریر فرمایا ہے۔ اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ اس کے پہلے حصہ میں، جو مختصر ہے، انہوں نے اُن مفتیانِ کرام کو مخاطب فرمایا ہے جنہوں نے پچھلے دنوں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف فتوے صادر فرمائے ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں، جو خاصا طویل ہے، مولانا نے جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو مخاطب فرمایا ہے۔

مفتیانِ کرام کو مخاطب کر کے انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں جہاں بہت سے پہلو ضرر کے ہیں وہاں اس کا ایک یہ مفید پہلو بھی ہے کہ اس کی دعوت اور اس کے لٹریچر سے بہت سے مغرب زدہ مسلمانوں کو ایمان نصیب ہو رہا ہے، اس لیے یہ بات کچھ اچھی نہیں ہوئی کہ آپ حضرات نے ان کو ایک دم سے کافر ہی بنا ڈالا، وہ سزا کے مستحق تو ضرور تھے لیکن اتنی سخت سزا کے مستحق نہیں تھے۔ پھر مولانا نے ان کو کچھ مفید مشورے دیے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کے خلاف کوئی مہم چلانی ہی ہے تو اس کو ان لائنوں پر چلانا چاہیے۔

جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو مخاطب کر کے انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ میں انہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ جماعت اسلامی کی ان مضرتوں اور خرابیوں پر نظر ڈالی ہے جن کو وہ یا ان کے دوسرے ہم خیال محسوس کرتے ہیں۔ اور دوسرے حصے میں اُن خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے از راہ نوازش کچھ عملی تدابیر بیان فرمائی ہیں۔

مضمون کا جو حصہ مفتیانِ کرام سے متعلق ہے اس کی نسبت ہم کچھ عرض کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

اس کے بارے میں حضرات مفتیانِ کرام ہی بہتر طریق پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے حق میں مولانا کی شفاعت اور خود اُن کے لیے مولانا کے قیمتی مشورے کس حد تک لائقِ قبول ہیں۔ مولانا ان کے گھر کے آدمی ہیں اگر وہ مولانا کے مشورے قبول کر لیں گے تو اس میں ان کی کوئی ہتک نہیں ہوگی۔ اور اگر خدانخواستہ ٹھکرا دیں گے تو ان شاءاللہ مولانا اس سے آزردہ بھی نہیں ہونگے۔ باقی رہے ہم نیازمند تو ہم اُن کے ہر فیصلہ پر راضی ہیں اور انشاءاللہ ہر زیادتی پر صبر کریں گے۔ البتہ مضمون کے اس حصہ سے تعرض کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے جو مولانا نے ہمیں مخاطب کر کے لکھا ہے۔ اور میں مولانا کو یقین دلاتا ہوں کہ جس جذبۂ اصلاح سے مجبور ہو کر انھوں نے یہ مضمون رقم فرمایا ہے اُسی جذبۂ اصلاح سے مجبور ہو کر میں بھی یہ سطریں حوالۂ قلم کر رہا ہوں۔

میں ابتدائے مضمون ہی میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس بات کی کوئی شکایت نہیں ہے کہ مولانا نے اپنے اِن احساسات کو پبلک کے سامنے لانے کے لیے ایک ایسا زمانہ منتخب کیا جبکہ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کے لیے اس کے مخالفین پوری طاقت کے ساتھ مہم چلا رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بسا اوقات دل میں یہ سوال پیدا ضرور ہوتا ہے کہ جماعت کے متعلق مولانا کے یہ احساسات کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں پھر مولانا نے ان کو اس سے پہلے پبلک کے سامنے لانا کیوں نہیں پسند فرمایا؟ اس فتنہ کے زمانہ ہی کو اس کے لیے کیوں انتخاب فرمایا؟ پھر مولانا جیسے اصلاح پسند آدمی سے یہ توقع بھی کچھ بیجا نہیں تھی کہ ایک خادمِ دین جماعت کے خلاف پبلک میں رائے زنی کرنے سے پہلے وہ اس کے ذمہ داروں سے تبادلۂ خیال اور اصلاحِ حال کی کوشش کرتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان اگر ملاقات کی راہ مسدود تھی تو مراسلت کی راہ مسدود نہیں تھی۔ جماعت کے اندر مولانا کے ایسے نیازمند بھی موجود تھے جن کو مولانا شرفِ مراسلت سے وقتاً فوقتاً مشرف فرماتے رہے ہیں، بڑی آسانی سے وہ اپنے یہ احساسات اور یہ مشورے ان کو بھیجکر ان کی بابت جماعت کا ردِّعمل معلوم کر سکتے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی بات کو بھی مولانا نے پسند نہیں فرمایا۔ حالانکہ مصلحتِ اسلام و مسلمین کے نقطۂ نظر سے یہ صورتیں

ان شاء اللہ زیادہ موزوں ثابت ہونیں۔ تاہم جیسا کہ میں نے اُوپر عرض کیا مجھے اس بات کی کوئی شکایت نہیں ہے کہ جماعت کے خلاف اس ہنگامہ کے زمانہ میں مولانا نے یہ مضمون کیوں لکھا ؟ مولانا کے احساسات کا پبلک میں آجانا ضروری تھا، کچھ مضائقہ نہیں اگر ہمارے نقطۂ نظر سے یہ مضمون نامناسب زمانہ میں لکھا گیا۔ اگر ہمارے مخالفین اس سے ہمارے خلاف اپنی ہنگامہ آرائیوں میں مدد لے سکتے ہیں تو ہم بھی اس کو بہت سی کہنہ غلط فہمیوں کے ازالہ کا واسطہ بنا سکتے ہیں اور مولانا ان شاء اللہ دونوں ہی پہلوؤں سے تعاون علی الخیر کے اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔

اب میں مولانا کے احساسات میں سے ایک ایک احساس کا تجزیہ کر کے اس کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱)

پہلی بات جو مولانا فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ :-

"آپ حضرات کی دعوت اور دعویٰ تو اس کام کا ہے جس کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے تھے لیکن اس کے لیے تنقیدی لٹریچر، جماعتی تنظیم اور عملی جدوجہد کی مختلف شکلوں میں جو کچھ ہو رہا ہے ذرا گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے لیے طریق کار بہت کچھ مستعار لیا ہے آج کل کی مادی تحریکوں سے۔"

جماعت پر مولانا کا یہ الزام نمبر ایک ہے، اور اس پر غور کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ الزام اچھا خاصہ سنگین بھی ہے لیکن لطف یہ ہے کہ اس پہلے ہی الزام کے بارے میں مولانا پوری طرح مطمئن نہیں ہیں کہ یہ جو کچھ وہ محسوس کر رہے ہیں فی الواقع اس کے لیے کوئی وجہ بھی ہے یا انہوں نے یوں ہی محسوس کر لیا ہے۔ وہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ "خود میرا اس بارہ میں کوئی متعین اور واضح احساس نہیں ہے جس پر مجھے اطمینان ہو" البتہ "بعض اہل بصیرت" نے، جنہوں نے جماعت کا لٹریچر "کچھ" پڑھا ہے، مولانا کے سامنے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور اس کے اصل مقصد کے سمجھنے میں جماعت اسلامی والے دور حاضر کی مادیت سے کچھ متاثر نظر آتے ہیں۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مولانا نے ایک واضح مسئلہ میں دوسرے "اہل بصیرت" سے، ایک جماعت کے بارے میں، کوئی احساس مستعار لینے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی؟ وہ خود صاحب علم ہیں۔ جماعت کے لٹریچر پر ایک نگاہ ڈال کر خود اندازہ کر سکتے تھے کہ کس جگہ انبیاء کی دعوت یا اس کے مقصد کے سمجھنے میں ہم دورِ حاضر کی مادیت سے متاثر ہوئے ہیں۔ اگر مولانا وقت کی مادی تحریکوں سے بے خبر تھے تو اسلام سے تو بے خبر نہیں تھے، وہ اتنا تو اندازہ بہر حال کر ہی سکتے تھے کہ کہاں کہاں انبیاء کی دعوت اور اس کے اصل مقصد کو پیش کرنے میں غلطیاں کی گئی ہیں۔ اس کام کے لیے کچھ ضروری نہیں تھا کہ مولانا جماعت اسلامی کا "الماری بھر دینے والا" پورا لٹریچر کھنگالتے۔ بلکہ اگر وہ میری صرف ایک کتاب "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" (جو حال ہی میں چھپ کر شائع ہوئی ہے) پڑھ لیتے تو ان کے سامنے ہمارا موقف پوری طرح واضح ہو جاتا کہ ہم نے انبیاء کی دعوت اور اس کے مقصد کو قرآن و حدیث سے معین کیا ہے یا وقت کی مادی تحریکوں سے؟

اگر مولانا نے اس معاملہ میں دوسروں کا احساس مستعار لینے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ وہ خود وقت کی مادیت اور مادی تحریکوں سے براہِ راست واقف نہیں ہیں، تو میں اس بات پر تو ان کو ضرور داد دوں گا کہ انہوں نے جس پہلو سے اپنے اندر کمی محسوس کی، دوسروں کی مدد سے اس کی تلافی کی کوشش فرمائی، لیکن ساتھ ہی میں اُن کو اس امر واقعہ سے بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے "اہل بصیرت" رہنماؤں نے اُن کی بڑی غلط رہنمائی کی ہے۔ اور اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو انہوں نے دیدہ و دانستہ، مولانا کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر ان کو جماعت اور جماعت کے لٹریچر سے بدگمان کرنا چاہا ہے۔ یا پھر اسلام اور وقت کی مادیت اور مادی تحریکات ہر چیز سے وہ خود بالکل نابلد ہیں اور انہوں نے مولانا کے حسنِ اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو اندھے راہ دکھانے والوں کی طرح بالکل غلط راہ دکھائی ہے۔ اور پھر ان سے بڑی غلطی خود مولانا کی ہے کہ اس قماش کے لوگوں نے جو کچھ کہہ دیا اس کو انہوں نے صرف باور ہی نہیں کر لیا بلکہ بے تکلف جماعت اسلامی کی فہرست جرائم میں اس کو جرم نمبر ا کی حیثیت سے درج بھی فرما دیا اور حضرت رسول کریم صلعم کی وہ بات ان کو یاد نہ آئی کہ کفیٰ بالمرءِ کذبًا ان

بحدث بکل ما سمع - انہیں اپنے راویوں سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جماعت اسلامی نے ان مادّی تحریکوں سے کیا چیز لی ہے؟ عقائد اور نظریات اور اصول لیے ہیں، یا وسائل اور تدابیر؟ اگر وہ کہتے کہ پہلی چیز لی ہے تو اس کی کم از کم کوئی ایک ہی نظیر ان سے دریافت کرنی چاہیے تھی۔ اور اگر وہ کہتے کہ دوسری چیز لی ہے تو پھر پوچھنا چاہیے تھا کہ اس میں سے جو کچھ لیا ہے وہ مباحات کے قبیل سے ہے یا مکروہات و محظورات کے قبیل سے؟ اگر مباحات میں سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز دوسروں سے لینا کوئی جرم نہیں ہے۔ اور اگر ممنوعات میں سے ہے تو وہ بے شک جرم ہے مگر اس کا کوئی ثبوت ہونا چاہیے کہ جماعت اسلامی نے ایسی کوئی چیز دوسروں سے اخذ کی ہے۔ یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ بغیر کسی تحقیق اور تشخیص کے محض ایک ہوائی الزام دوسروں پر چسپاں کر دیا جائے۔

مولانا اور ان کے "اہل بصیرت" مشیروں کے نزدیک جماعت اسلامی اور اس کی جدوجہد وقت کی جن مادی تحریکوں سے متاثر ہے اُن میں سے نام لے کر مولانا نے صرف اشتراکیت کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے میں بھی اسی کو بحث کے لیے انتخاب کرتا ہوں اور اس کی بعض نمایاں خصوصیات کا حوالہ دے کر مولانا سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ ان میں سے کون کون سی خصوصیات وہ جماعت اسلامی کے اندر پا رہے ہیں۔

اشتراکیت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سارا فلسفہ پیٹ کے محور پر گھومتا ہے۔ اُسی سے اشتراکیوں کے ہاں تاریخ بنتی ہے۔ اُسی سے فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ اُسی سے نظریہ ہائے حیات جنم لیتے ہیں اور یہی تمام اقدار و اخلاق کا سرچشمہ ہے —— کیا فی الواقع مولانا کے نزدیک جماعت اسلامی کی تمام سرگرمیوں کا محور بھی یہ پیٹ ہی ہے اور خدا، رسول اور اسلام کا نام وہ محض عوام فریبی کے لیے استعمال کر رہی ہے؟

اشتراکیت کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عملی تدبیروں میں طبقاتی جنگ سب سے زیادہ موثر حربہ ہے۔ وہ ناداروں کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکاتی ہے اور جب وہ پوری طرح بھڑک جاتے ہیں تو دونوں میں جنگ برپا کر کے قلیل التعداد گروہ کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیتی

ہے ——— کیا مولانا ایمانداری کے ساتھ فرما سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی بھی اپنی جدو جہد میں اسی طبقاتی جنگ کے حربہ سے کام لے رہی ہے؟

اشتراکیت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی عملی سرگرمیوں میں بیشتر خفیہ طریقوں اور تخریبی اقدامات پر اعتماد کرتی ہے ——— کیا مولانا کے علم میں کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جس کی بنا پر وہ دعویٰ کر سکتے ہوں کہ جماعت اسلامی بھی اپنی عملی سرگرمیوں میں خفیہ طریقوں اور تخریبی اقدامات پر (کسی درجہ میں بھی سہی) اعتماد کرتی ہے؟

اشتراکی ادب کی مقبولیت کا سارا راز اس کی فحاشی، اس کی عریاں نگاری، اور فرائڈ کی جنسیات پرستی میں پوشیدہ ہے۔ اشتراکی اہل قلم پہلے اسی متاع فاسد کو لے کر عوام میں گھستے ہیں اور جب ان چیزوں کی کشش سے سادہ لوح اور جاہل عوام اور جنسیات کے بھوکے نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ ان کے اندر مارکس اور فرائڈ کے معاشی اور اخلاقی نظریات بھی اُتار دیتے ہیں ——— کیا مولانا فرما سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی بھی انہی حربوں سے کام لے کر اپنے ادب کو مقبول بنانے کی کوشش کر رہی ہے؟ اور جماعت اسلامی کا "الماری بھر دینے والا لٹریچر" انہی چیزوں پر مشتمل ہے؟

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے کسی ادنیٰ شائبہ کی بھی جماعت اسلامی کے کسی گوشہ میں نشان دہی کی جا سکتی ہو۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ مولانا اور ان کے "اہل بصیرت مشیروں" نے آخر کس قدرِ مشترک کی بنا پر جماعتِ اسلامی اور اشتراکیت کے درمیان رشتہ جوڑا ہے۔ کیا انکار خدا اور انکارِ آخرت دونوں کے درمیان مشترک ہے؟ کیا جنسی انارکی اور اباحیت میں دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہے؟ کیا اخلاقی اقدار کی نفی میں دونوں ہم مذہب ہیں؟ کیا ملکیت ذاتی کے ابطال میں دونوں ہم عنان ہیں؟ آخر وہ کونسی چھوٹی یا بڑی، ظاہری یا باطنی، مادی یا روحانی نسبت ہے جو دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اور جس کی بنا پر دونوں کا رشتہ جوڑا جا سکتا ہے؟ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

مولانا اور ان کے "اہل بصیرت رفقاء" یا تو جماعت سے واقف نہیں ہیں، یا اشتراکیت سے واقف نہیں ہیں، یا ان دونوں ہی سے بالکل بے خبر ہیں۔

مولانا نے جماعت اسلامی اور اشتراکیت کے درمیان جوڑ ملانے کے لیے جو باتیں بطور دلیل بیان کی ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر مختصراً ان کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

مولانا کی پہلی دلیل یہ ہے، کہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں فکر آخرت کی افسوس ناک حد تک کمی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں تزکیۂ اخلاق اور تہذیب نفس کا کام کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے بعض اخبارات اپنے مخالفوں کو بدنام کرنے کے لیے وہ سارے غلط طریقے استعمال کرتے ہیں جو مادی تحریکوں کے حامی پارٹی باز کیا کرتے ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ایک رکن نے (جس کا پتہ نشان انہوں نے کچھ نہیں دیا) مولانا کو یہ خبر دی ہے کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں کمیونسٹوں کی مثال کو اس کثرت سے دہرایا گیا ہے کہ انہی کا طرز عمل ارکان جماعت کے لیے "اسوۂ حسنہ" بن گیا ہے۔

مجھے بالترتیب مولانا کے ان قیمتی دلائل کا جائزہ لینا ہے۔

مولانا کو جماعت اسلامی کے کاموں میں فکر آخرت کی جو کمی محسوس ہوئی ہے اس کی اصل وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان فکر آخرت کا تصور ہی مختلف ہے۔ ایک خاص طرز کے ماحول میں رہنے سہنے کی وجہ سے ان کے ذہن نے فکر آخرت کو ایک مخصوص ہیئت کے ساتھ باندھ دیا ہے، اس وجہ سے وہ صرف اسی فکر آخرت کو فکر آخرت سمجھتے ہیں جس کا ظہور ان کی جانی پہچانی معتاد صورتوں میں ہو۔ لیکن اگر وہی چیز دوسری صورتوں میں جلوہ گر ہو، یا غیر محدود پیمانے پر پوری زندگی کی وسعتوں میں پھیل گئی ہو تو مولانا اور ان کی طرح سوچنے والے دوسرے

لوگ وہاں کسی فکرِ آخرت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس ہم فکرِ آخرت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کے دل میں خدا کے حضور اپنی ذمہ داری و مسئولیت کا، اور دنیا پر آخرت کی ترجیح کا خیال گہرا جم جائے اور اس خیال کے اثر سے اس کی پوری زندگی ایک ذمہ دارانہ زندگی بن جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ زندگی کسی خانقاہ یا دارالعلوم میں بسر ہو رہی ہو یا کسی کالج یا کسی تجارتی منڈی، یا کسی فیکٹری میں۔ ہم جہاں بھی حدود اللہ کی پابندی، فرائض کی ادائیگی، حرام سے اجتناب، منکر سے نفرت اور معروف سے لگاؤ پاتے ہیں، وہاں ہم کو خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے۔ بلکہ جہاں معصیت کے مواقع سب سے زیادہ اور لغزشِ قدم کے امکانات سب سے بڑھ کر ہیں وہاں حدود کی پابندی میں ہم کو فکرِ آخرت کا جلوہ سب سے زیادہ نظر آتا ہے خواہ ایسا شخص بالکل سیدھی سادھی دنیاداروں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو اور فنِ دینداری کے نقطۂ نظر سے اس کا شمار بالکل اناڑیوں ہی میں کیوں نہ ہوتا ہو۔

ہمارے اور مولانا کے تصورِ فکرِ آخرت کا ایک اور اہم اختلاف یہ بھی ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں تنویر پیدا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ زندگی فکرِ آخرت کے نور سے جگمگا اٹھی ہے، اگرچہ اس زندگی کے دوسرے گوشوں میں جاہلیت کی کتنی ہی گندگیاں اور آلودگیاں موجود ہوں۔ لیکن ہم زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس لیے جب تک کسی شخص کی زندگی بحیثیت مجموعی حدود اللہ کے اندر نہ آجائے اس وقت تک ہم فکرِ آخرت کے نقطۂ نظر سے اس کو ناقص سمجھتے ہیں۔ اس اختلاف کے سبب سے اگرچہ ہمارا حاصل مولانا کے حاصل سے زیادہ ہو لیکن نمائش کے نقطۂ نظر سے ہم خسارہ میں رہیں گے۔ کیونکہ دیکھنے والوں کو وہ تقویٰ جو زندگی کے تمام وسیع اطراف میں پھیلا ہوا ہے اُس تقویٰ کے مقابل میں بہرحال کم نظر آئے گا جو زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں مرتکز کر دیا گیا ہو۔

ہمارے اور مولانا کے تصور میں ایک اختلاف اس پہلو سے بھی ہے کہ وہ فکرِ آخرت کا مشاہدہ صرف صوفیانہ طرز کے اذکار و اشغال ہی میں کرنے کے خوگر ہیں۔ جہاں یہ چیز نہ پائی جائے

وہ سمجھتے ہیں کہ بھلا یہاں فکرِ آخرت کا کیا کام ؟ اور ہم اِس فکرِ آخرت کا مشاہدہ اُن سرگرمیوں میں کرنے کے عادی ہیں جو ایک آدمی اللہ کے دین کو اپنے اوپر اور اپنے ماحول کے اوپر قائم کرنے میں صرف کرتا ہے۔ ہم اُس حمیت میں اِس چیز کو ڈھونڈھتے ہیں جو اس کے اندر اللہ کے دین اور اس کے احکام کی پامالی کو دیکھ کر اُبھرتی ہے۔ اُس غیرت اور بے چینی میں اِس کو تلاش کرتے ہیں جو ایک مسلمان کے اندر فسق و فجور کے موجودہ ہنگاموں کو دیکھ کر پیدا ہونی چاہیے۔ اُس کرب اور اُس غم میں اس کو دیکھتے ہیں جس میں ایک بندۂ حق خلقِ خدا کی گمراہیوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اِن پہلوؤں سے جب ہم اپنے رفیقوں کو اور خود اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو ہم ان میں بھی اور اپنے آپ میں بھی بڑی کمیاں پاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی غمِ عشق ہم پر اتنا غالب نہیں آیا ہے کہ غمِ روزگار کو بالکل ہی بھلا دے۔ تاہم اگر مولانا جماعت اسلامی کو سمجھنا چاہتے ہیں اور فکرِ آخرت کے نقطۂ نظر سے اس کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ایک ایک رکنِ جماعت سے بلکہ متاثرینِ جماعت تک سے پوچھیں کہ پہلے اُن کی زندگی کیا تھی اور اب کیا ہے ؟ پہلے وہ حلال و حرام میں عملاً کتنی تمیز کرتے تھے اور اب کس قدر کرتے ہیں ؟ پہلے احکامِ شرعیہ کی کتنی پابندی کرتے تھے اور اب کتنی کرتے ہیں ؟ پہلے اپنے معاملات میں اخلاقی حدود کا کتنا لحاظ کرتے تھے اور اب کتنا کرتے ہیں ؟ پہلے دین و ایمان کے تقاضوں کو کتنا سمجھتے اور پورا کرتے تھے اور اب کتنا سمجھتے اور پورا کرتے ہیں ؟ پہلے اسلام اور جاہلیت کے فرق کی باریکیوں تک اُن کی نگاہ کہاں تک پہنچتی تھی اور اب کہاں تک پہنچتی ہے ؟ پہلے کفر و فسق کے تسلط سے اُن کے دل کی کڑھن کا کیا حال تھا اور اب کیا حال ہے ؟ پہلے اقامتِ دین کی خواہش اور کوشش ان کی زندگی میں کیا مقام رکھتی تھی اور اب کیا رکھتی ہے ؟ یہ سوالات مولانا صرف اُنہی لوگوں سے نہ کریں جو مغربیت زدہ طبقے میں سے نکل کر جماعت کی طرف آئے ہیں، بلکہ اُن لوگوں سے بھی کریں جو پہلے مولویوں اور صوفیوں اور دیندار گروہوں میں شامل تھے۔ اگر ان سوالات کا یہ جواب ملے کہ فی الواقع ان کے اندر اِن حیثیات سے بڑا فرق ہو گیا ہے

تو پھر مولانا ان سے یہ بھی پوچھیں کہ آیا ان کے اندر یہ فرق کسی دنیوی لالچ یا کسی دنیوی خوف سے ہوا ہے یا اس کی وجہ خدا کی خدائی پر ایمان اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے؟ مجھے اُمید ہے کہ ان سوالوں کے جواب سے مولانا کی بدگمانی بہت بڑی حد تک دُور ہو جائے گی۔ اور کیا بعید ہے کہ اس کے بعد اپنی جماعت اور جماعت اسلامی کا فرق بھی کچھ ان کی سمجھ میں آجائے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی لائق غور ہے۔ اس جماعت میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے کاروبار صرف اس لیے بیٹھ گئے ہیں یا ماند پڑ گئے ہیں کہ وہ حرام اور مشکوک طریقوں کو اختیار نہیں کرتے۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بار بار اپنے رزق کے ایک راستہ کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا ہے اور اس میں نقصانات اٹھائے ہیں، صرف اس لیے کہ وہ رزق حلال کے طالب ہیں۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اچھی خاصی ملازمتیں صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ یا تو ان ملازمتوں میں وہ حرام کمانے پر مجبور ہوتے تھے یا ان کو اقامتِ دین کی سعی سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی میں کسی طریقے پر عامل تھے اور جونہی انہیں معلوم ہوا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور کسی نقصان یا تکلیف کی پروا نہ کی۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جو اپنے خاندان میں مطعون ہوئے، اپنے دوستوں اور عزیزوں سے چھوٹے اپنی برادری اور بستی میں ستائے گئے، حتیٰ کہ اپنی جدّی میراثوں تک سے محروم ہوئے، صرف اس لیے کہ وہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے تھے اور جن لوگوں سے ان کی زندگی وابستہ تھی وہ ان کے اس رویہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر یہ منظر ابھی حال ہی میں لوگوں کی نگاہوں سے گذر چکا ہے کہ پنجاب کے انتخابات میں جماعت نے تقریباً تین چار ہزار نئے اور پرانے کارکنوں کو استعمال کیا اور گنتی کے چند آدمیوں کو چھوڑ کر یہ سب کے سب، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، انتخاب کے اس پورے ہنگامے میں شریعت اور اخلاق کے حدود پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی مالی قربانیوں اور اپنی محنتوں کو اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھا لیکن ایک سیٹ بھی ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے سامنے ہر طرح کے

لالچ بھی آئے اور دھمکیاں بھی آئیں مگر وہ سیدھے راستہ سے نہ ہٹے۔ ان کے خلاف ہر طرح کے جھوٹ بولے گئے، مگر ان کی زبان جھوٹ سے آلودہ نہ ہوئی۔ ان کو برسر بازار منہ در منہ گالیاں دی گئیں، مگر انہوں نے کبھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا۔ حالانکہ یہ انتخابات وہ چیز ہیں جس کے میدان میں اتر کر عام دنیا دار ہی نہیں بڑے بڑے مولوی اور صوفی اور خانقاہی تزکیہ نفس کے فارغ التحصیل بھی تقویٰ کے حدود پر قائم نہیں رہ سکے ہیں[1]۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ اگر خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب اور آخرت کی جواب دہی کی وجہ سے نہیں ہے تو اس کی تہ میں اور کس محرک کی نشان دہی کی جا سکتی ہے؟ اگر اس پورے طرز عمل کا محرک ایمان باللہ و بالیوم الآخر ہی ہے تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کیا فکر آخرت ہے جس کی کمی مولانا کو جماعت اسلامی میں افسوسناک حد تک نظر آ رہی ہے؟ کیا مولانا کا مطلب یہ ہے کہ جماعت بھی انہی مکاریوں میں مبتلا ہو جائے جن میں بہت سے دینداری کی نمائش کرنے والے لوگ مبتلا ہیں کہ زبان پر تو ہر وقت خدا اور آخرت کا ذکر ہو اور بظاہر خوب رونے دھونے کی مشق کی جائے مگر معاملات اور زندگی بھر کے طرز عمل میں اس ذکر دلسوز کا کوئی اثر نہ پایا جائے۔

مولانا کی دوسری دلیل بھی نہایت غلط اور جماعت کے حالات سے بے خبری پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کا کام اہلِ تصوف کے طریقہ پر نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے یہاں تزکیۂ نفس کا کام سرے سے ہو ہی نہیں رہا ہے۔ ہم اہلِ تصوف کے طریقہ کو صحیح نہیں سمجھتے، اس لیے ہم نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ اس سے نفس کا جتنا تزکیہ ہوتا ہے اس سے زیادہ اس کے اندر خرابیاں ابھر آتی ہیں۔ اس لیے ہم نے اس کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہم نے کتاب و سنت کے موافق پایا ہے

[1] ممکن ہے مولانا محمد منظور صاحب کو اب یاد نہ رہا ہو، مگر ہم انہیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ خود ایک مرتبہ اپنا ذاتی تجربہ ہمارے سامنے بیان کر چکے ہیں کہ انتخابات کے میدان میں اتر کر ان کے اپنے گروہ کے علماء اور صلحاء و اتقیاء کس طرح اخلاق و شرع کی ساری حدوں کو پھاند گئے تھے۔

اس طریقہ کی تفصیلات بتانا تو اس وقت میرے لیے مشکل ہے لیکن چند باتوں کی طرف بر سبیل تذکرہ اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

اس سلسلہ میں ہم نے پہلا کام تو یہ کیا ہے کہ قرآن شریف سے وہ چیزیں چھانٹ لی ہیں جو خاص طور پر تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح احادیث نبوی کے وسیع ذخیرہ میں جو چیزیں تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق سے متعلق ہیں وہ بھی منتخب کر لی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس احسان کے جو اصول و مبادی قرآن و حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں وہ بھی ہم نے مرتب کر ڈالے ہیں۔ پھر جماعت کے لٹریچر میں سے ہم نے وہ چیزیں نشان زد کر دی ہیں جو ہمارے اصلی مقصد کی طرف براہ راست رہنمائی کرتی ہیں۔ اور اپنے تمام ارکان کے لیے یہ ضروری قرار دے دیا ہے کہ وہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ اس کورس سے کسی قابل اعتماد نگران کی نگرانی میں ضرور گذر جایا کریں۔ جماعتی طور پر اس بات کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ ارکان کا محاسبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں حدود اللہ کی محافظت کے عادی ہیں اور اگر ان سے کوئی خلاف ورزی صادر ہو جائے تو شریعت کی ہدایات کی روشنی میں اس کی تلافی کی کوشش کریں۔

یہ ساری باتیں ہم نے تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس ہی کی غرض سے اختیار کی ہیں۔ اگر مولانا کو ان باتوں کی اطلاع نہیں ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دنیا میں کوئی کام ہو ہی نہیں رہا ہے۔ کام سے زیادہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنا، اور وہ بھی تزکیہ و تقویٰ کا ڈھنڈورا، یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔

جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات پر یہ الزام کہ وہ اپنے مخالفوں کو بدنام کرنے کے لیے وہی سارے طریقے استعمال کر رہے ہیں جو مادی تحریکوں کے حامی "پارٹی باز" کیا کرتے ہیں، میرے نزدیک صریح بہتان ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کو ان جوابات کی چوٹ لگی ہو جو حال میں ان کے گروہ کے اکابر کی فتویٰ بازی کے مقابلے میں جماعت کے اہل قلم کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر مولانا گروہی عصبیت سے کام نہ لیں بلکہ عدل و قسط کے ساتھ حملوں اور ان کے

جوابات کا موازنہ فرمائیں تو ان کا اپنا دل گواہی دیگا کہ ظلم دوسری طرف سے ہوا تھا اور جماعت اسلامی کے لوگوں نے اس کا جو کچھ بھی جواب دیا وہ قرآن مجید کی بتائی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے دیا۔ مولانا ہمارے کسی ایک لفظ یا فقرے کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتے جو حق سے متجاوز ہو۔ مگر ہم ان کے گروہ کے اکابر کی عبارتیں کی عبارتیں ایسی پیش کر سکتے ہیں جو اخلاق اور دیانت کی حدود سے صریحًا متجاوز ہیں۔

لیکن اگر مولانا اس تازہ چوٹ سے متاثر نہیں ہیں بلکہ ان کی یہ شکایات جماعت کے اخبارات و رسائل کی عام روش سے متعلق ہے تو میں عرض کروں گا کہ ہمارے کسی اخبار یا رسالہ کو مادی تحریکوں کے پارٹی باز اخباروں کی صف میں رکھ دینا شانِ احتیاط و تقوی سے بہت بعید ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بسا اوقات ہمارے نوجوان لکھنے والوں کے قلم سے، ایسے فقرے نکل گئے ہیں جو جماعت کے مزاج کے خلاف تھے لیکن اُن کے خلاف سب سے زیادہ آواز خود جماعت کے ارکان نے اٹھائی ہے۔ ہماری مجلس شوریٰ کا کوئی جلسہ نہیں ہوتا جس میں جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات و رسائل کی تحریریں زیر بحث نہ آتی ہوں اور ہم جن باتوں کو ذرا بھی انصاف اور راست بازی کے خلاف پاتے ہیں ان کو روکنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ ترجمان القرآن نے معیار بھی ایسا بلند قائم کر دیا ہے کہ ہر قسم کا اخبار یا رسالہ جماعت میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ جو اخبارات راہ اعتدال اور متانت سے ہٹ کر چلتے ہیں جماعت کا مزاج خود بخود ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

اسلامی اصولوں کی پابندی نے جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات کو مادّی اعتبار سے جو نقصان پہنچایا ہے ہمارے بے رحم نقادوں کو شاید اس کی خبر نہیں ہے۔ ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز طرز جدید کے چوٹی کے اخبار نویسوں میں تھے اور اگر مذاق حال کا لحاظ کر کے وہ کوئی اخبار نکالتے تو شاید اس ملک میں اُن کا اخبار اول درجہ کے کثیر الاشاعت اخباروں میں ہوتا۔ لیکن جماعت نے ان کے اخبار کو ایسا بے مرچ و نمک کر کے رکھ دیا ہے کہ اسی کو بسا غنیمت سمجھا جا رہا ہے کہ کوثر نکل رہا ہے۔ اسی طرح نعیم صدیقی صاحب کے قلم میں خدا نے اتنی طاقت دی ہے کہ اگر

وہ فی الواقع "پارٹی باز" اخبار نویسوں کی طرح لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے پر آجاتے تو ایک دنیا ان سے پناہ مانگتی۔ لیکن اللہ نے ان کو توفیق بخشی کہ وہ ایک نیک کام میں لگ گئے اور اب حال یہ ہے کہ اس غریب کو اپنے ایک ایک فقرہ کا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں حساب دینا پڑتا ہے۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا!

اور انہی جماعتی اور اخلاقی پابندیوں کا یہ اثر ہے کہ "چراغ راہ" ہمیشہ ٹمٹاتا ہی رہتا ہے۔ اگر اس کا ایڈیٹر پارٹی باز اخبار نویسوں کی طرح بے لگام ہوتا تو شاید اس فساد مذاق کے زمانہ میں وہ اپنے قلم کی سب سے زیادہ قیمت وصول کر سکتا۔

بہرحال مولانا نے جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات و رسائل پر یہ الزام بہت ہی غلط لگایا ہے۔ میں مولانا کو پہلے چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کریں اور پھر انہی کو حکم بھی مانتا ہوں کہ وہی فیصلہ بھی کریں کہ کیا فی الواقع ان کا یہ الزام صحیح ہے؟ کیا واقعۃً کوثر، ترجمان القرآن، چراغِ راہ اور جہانِ نو اسی قسم کے پرچے ہیں جیسے اس ملک میں دوسرے اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں؟ اگر مولانا اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ صریح بہتان لگاتے وقت خود ان کی اپنی فکرِ آخرت کو کیا ہو گیا تھا؟

مولانا کی چوتھی دلیل بھی نہایت ضعیف ہے۔ جماعت کے لٹریچر میں کمیونسٹوں کی مثال دہرائی ضرور گئی ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کسی ایک جگہ بھی یہ مثال جماعت کے کارکنوں کے سامنے اتباع اور "اسوۂ حسنہ" بنانے کے لیے رکھی گئی ہو۔ یہ مثال تو ہمارے لٹریچر میں جہاں بھی پیش کی گئی ہے عبرت پذیری کے لیے پیش کی گئی ہے کہ اشتراکی ایک غلط نظامِ زندگی کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے اس عزم و ہمت کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہ ان کے ذہن میں کبھی یہ خطرہ بھی نہیں گذرتا کہ ہم ناکام ہوں گے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ایک خدائی نظامِ زندگی رکھتے ہوئے بھی سہمے جا رہے ہیں کہ بھلا موجودہ دنیا میں یہ کس طرح قائم ہو سکے گا؟ اگر کسی رکنِ جماعت نے اس مثال کو، جو

عبرت حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی تھی، یہ سمجھ لیا کہ یہ "اسوۂ حسنہ" بنانے کے لیے پیش کی گئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بڑی سخت بلادتِ ذہن کا ثبوت دیا ہے اور مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ ان کو ٹوکتے کہ خدا کے بندے یہ مثال عبرت حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے نہ کہ اسوۂ حسنہ بنانے کے لیے!۔ لیکن مولانا نے کمال کیا کہ ایک بلید الذہن آدمی کی ایک احمقانہ بات کو ایک نکتۂ معرفت سمجھ کر نوٹ کر لیا اور جماعت کی فہرست جرائم میں اس کو بھی سجا کر رکھ دیا۔

میں مولانا سے نہایت ادب سے یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآن مجید میں شیطان کے اغوا کی مثال کئی جگہ دہرائی گئی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ تبلیغی جماعت کا ایک کارکن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ قرآن میں شیطان کے اغوا کی مثالیں اتنی کثرت سے دہرائی گئی ہیں کہ میرے لیے اسی کمبخت کا طریقہ "اسوۂ حسنہ" بن گیا ہے اور ہمارے اکثر رفیق اب اسی طریقہ پر کام کرنا چاہتے ہیں تو مولانا اس کو کیا جواب دیتے؟ یہی تو کہتے کہ خدا کے بندے یہ مثال عبرت پذیری کے لیے ہے "اسوۂ حسنہ" بنانے کے لیے نہیں ہے۔ آخر یہی جواب مولانا نے ہمارے اِن رکنِ جماعت کو کیوں نہیں دے دیا؟

یہ بات میں اس مفروضہ پر لکھ رہا ہوں کہ فی الواقع جماعت میں ایسا کوئی جاہل رکن موجود ہے اور یہ اسی کا قول ہے جسے مولانا نے نقل فرمایا ہے۔ اگرچہ جماعتِ اسلامی میں اس ٹائپ کے آدمی کی موجودگی باور کرنے کے لائق نہیں ہے۔ تاہم اگر یہ واقعہ ہے تو ہمیں اب اس کا بندوبست کرنا پڑے گا کہ جماعت کے اندر ایسے کند ذہن لوگ کسی طرح نہ داخل ہوسکیں جو داخل تو ہوں تو جماعت اسلامی کے اندر لیکن پیروی کریں کمیونسٹوں کے "اسوۂ حسنہ" کی۔

―――― (۳-۲) ――――

مولانا کو دوسری شکایت یہ ہے کہ تقلید و اجتہاد کے بارے میں جماعت کے ذمہ داروں کا جو مسلک ہے اگرچہ وہ بجائے خود مولانا کے لیے ناقابل برداشت نہیں ہے لیکن اس کے سبب سے اللہ کا مقدس دین بے علم مجتہدوں کی آراء و اہواء کا تختۂ مشق بن رہا ہے، اور یہ چیز مولانا کے

لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

اسی طرح تیسری شکایت یہ ہے کہ بہت سے لوگ جماعت کا لٹریچر پڑھ کہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ دین کی روح اور اس کے مغز کو پا گئے ہیں اور اگر کوئی چیز وہ ذرا بھی اس سے الگ پاتے ہیں تو اس پر بڑی بے باکی سے تنقید کرتے ہیں۔

مولانا نے ازراہِ عنایت ان دونوں قصوروں سے جماعت کے ذمہ داروں کو ایک حد تک بری قرار دیا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ اِن غلط فہمیوں کے سدباب کے لیے لٹریچر میں تنبیہات موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب لوگ غلط فہمیوں میں پڑنے سے باز نہیں آتے تو مولانا یہ ضرورت محسوس فرماتے ہیں کہ لٹریچر پر نظرِ ثانی کی جائے۔

جہاں تک پہلی شکایت کا تعلق ہے اس کا جواب مَیں ان کے گروہ کے ایک پیرزادہ صاحب (حکیم عبدالرشید محمود صاحب) کو انہی صفحات میں دے چکا ہوں۔ جماعت کے بے علم تو درکنار جماعت کے اہلِ علم بھی اجتہاد کی ذمہ داریوں سے کتراتے ہیں۔ اور اگر کبھی کسی نے دینی معاملات میں علم کے بغیر کلام کرنے کی جرأت کی ہے تو اس کو نہایت سختی کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ مَیں سچائی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ پچھلے چار پانچ سالوں کے اندر میرے علم میں کوئی ایسی بات نہیں آئی ہے جو مولانا کے الزام کی تصدیق کرتی ہو۔ اگر مولانا کوئی متعین مثال پیش کریں تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے اور ہم اس کے سدباب کی ہر کوشش کریں گے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اندر کوئی شخص پڑھا لکھا اور دین کو جاننے والا ہے بھی؟ مولانا تو ازراہِ عنایت ایک آدھ کو شاید کچھ پڑھا لکھا سمجھتے ہوں، لیکن وہ ذرا دیوبند اور مظاہر العلوم کے مفتیانِ دین سے بھی تو استفسار کر لیں کہ وہ حضرات بھی اس سے اتفاق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے کہ اگر ان کو اس سے اتفاق نہ ہوا تو سوال صرف لٹریچر پر نظرِ ثانی کا نہیں رہتا بلکہ پورے لٹریچر کو دریا برد کر دینے کا پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے جہاں تک معلوم ہے یہ حضرات مولانا مودودی کو بھی دین کے معاملہ میں کلام کرنے کا حقدار نہیں سمجھتے۔

تیسری شکایت کے جواب میں گذارش ہے کہ اس معاملہ میں حقیقت سے زیادہ ہمارے مخالفین کے احساس کہتری کو دخل ہے۔ جماعت کے آدمی جب علماء حضرات کے سامنے دین کے وہ بدیہی تقاضے پیش کرتے ہیں جو انہوں نے جماعت کے لٹریچر سے سمجھے ہیں تو ان حضرات کے دل کو سخت چوٹ لگتی ہے کہ یہ دیکھو، یہ ہمیں دین سمجھانے آئے ہیں! اس طرح بات بسا اوقات بڑھتے بڑھتے بڑھ جاتی ہے اور ایسے مسائل زیر بحث آجاتے ہیں جن سے انہیں یہ بدگمانی ہوجاتی ہے کہ جماعت اسلامی والے اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور دوسروں کو علم سے عاری خیال کرتے ہیں۔ اس کے سدباب کے لیے ابتدا ہی میں ہم نے کارکنوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ علماء اور مشایخ کے طبقہ میں وہی لوگ جائیں جو اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اب ہم نے پھر سختی کے ساتھ ہدایات جاری کر دی ہیں کہ ان حضرات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اب اس سلسلہ میں لوگ محتاط ہوجائیں گے اور مولانا کی یہ شکایت ان شاء اللہ لٹریچر پر نظرِ ثانی کے بغیر ہی رفع ہوجائیگی۔

لیکن مولانا سے ایک گذارش ضرور ہے کہ آخر وہی بد دماغی کیوں قابلِ علاج ہے جو جماعت اسلامی کے لٹریچر کے مطالعہ سے لوگوں میں پیدا ہوجاتی ہے؟ مولانا اس بد دماغی کی بھی تو خبر لیں جو مدتوں سے ہمارے دینی مدرسوں میں پرورش پا رہی ہے کہ نصاب کی چند کتابیں اُلٹی سیدھی پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو دین کا مختارِ کل سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں میں دین کا حصہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا آٹے میں نمک کا۔

(۴)

چوتھا بڑا مفسدہ جس کا مولانا نے جماعت کے اندر پتہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ جماعت کا لٹریچر پڑھنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب سے اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش ہوئی، اگرچہ مختلف زمانوں میں اصلاح و تجدید کی کوششیں کی گئیں لیکن کوئی داعی اور کوئی مصلح بھی پورے اسلام کو لے کر کھڑا نہیں ہوا، بلکہ محض جزوی اصلاحات ہی لوگ کرتے رہے اور اس میں بھی ان سے بڑی بڑی غلطیاں ہوئیں ...... ساڑھے تیرہ سو

سال پہلے کے اصلی اور پورے اسلام کو بالکل صحیح طریق پر، قائم کرنے کے لیے اب جماعت اسلامی کھڑی ہوئی ہے اور یہی اس کا طغرائے امتیاز ہے۔

مولانا نے یہ نتیجہ مودودی صاحب کی غالباً اُن تحریروں سے نکالا ہے جن میں انہوں نے امام غزالی صاحبؒ، مجدد صاحبؒ، اور شاہ صاحب وغیرہ کو مجدد اور مصلح تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بعض فروگذاشتوں پر تنقید بھی کر ڈالی ہے۔ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو مجدد اور مصلح مانتے ہو تو پھر ان کی باتوں اور ان کے کاموں میں مین میخ نکالنے کے کیا معنی؟ اور اگر ان کے کاموں میں بھی نقائص موجود تھے تو یہ مجدد کیسے ہوئے؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے تاریخ کے کسی دور میں بھی پورا دین لوگوں کے سامنے نکھر کے آہی نہ سکا۔ کیونکہ دین کے نکھارنے والے تو یہی مجدد دین تھے اور تم ان کے کاموں میں بھی کیڑے ڈالتے ہو۔

مولانا یہ شبہ وارد کرنے کے بعد پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارا موقف فی الواقع یہی ہے تو پھر وہ حدیثیں کہاں گئیں جن میں حضور نبی کریم صلعم نے خبر دی ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہیگا اور وہ لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرتا رہے گا؟

مولانا کا یہ معارضہ بادی النظر میں قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس امت کے ہر دور میں ایک گروہ کے حق پر قائم رہنے کی خوش خبری موجود ہے تو غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے لیکن دل یہی گواہی دیتا ہے کہ ابن تیمیہؒ، مجدد صاحبؒ، شاہ صاحبؒ اور اس زمرہ کے دوسرے اکابر ان شاء اللہ ضرور حق پر ہیں اور ان کی خدمات ان شاء اللہ ضرور تجدید دین میں شمار ہونگی۔ اس امر کو مان لینے کے بعد یہ بات کچھ دل میں کھٹکتی سی ہے کہ یہ لوگ بھی، جو حدیث کے فحویٰ کے مطابق مصلح اور مجدد دین ہیں، دین کے معاملہ میں غلطیاں کر جائیں۔ لیکن یہ شبہ ادنیٰ تامل دور ہو جاتا ہے۔ کسی شخص یا کسی گروہ کا حق پر ہونا یا اس کا مصلح و مجدد ہونا اس امر کو ہرگز مستلزم نہیں ہے کہ وہ معصوم بھی ہو۔ عصمت خاصۂ انبیاء ہے اور اُن کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس شرف سے ممتاز ہوتا ہو۔ انبیاء کے سوا کسی شخص یا کسی گروہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ معصوم ہے

اور اس سے کوئی غلطی ممکن ہی نہیں ہے، ایک سخت قسم کی ضلالت ہے۔ احادیث میں جس گروہ مصلحین کے برابر پیدا ہوتے رہنے کی جو خبر دی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ حق پر قائم رہیں گے اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرتے رہیں گے۔ حق پر قائم رہنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص سے کوئی غلطی ہی صادر نہ ہو۔ اس کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ متبع ہدیٰ اور طالب طریقۂ جاہلیت نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اجتہاد میں غلطی کر جائے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی امر کو مسلمانوں اور اسلام کے مصالح کے مطابق سمجھے لیکن فی الواقع وہ مصالح کے خلاف ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی امر کو روحِ دین کے مطابق خیال کر کے اختیار کر لے اور اس کا گمان یہ ہو کہ یہ کم از کم نعم البدعۃ کے حکم میں داخل ہے، لیکن اس کے بعد آنے والے اس کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہوسکیں اور وہ اس کو بدل ڈالیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص زمانہ کے عقلی و علمی تقاضے تہذیب نفس و تزکیہ اخلاق کی کسی تدبیر کو احوال و ظروف کے موافق قرار دے دیں اور اس عہد کے مصلحین اس چیز کے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ پائیں، بلکہ طبائع کو اس تدبیر کے ساتھ مانوس پا کر ایک حد خاص تک اس کو اختیار کر لیں اور اس کی اصلاح کے کام کو بعد کے کام کرنے والوں پر چھوڑ دیں۔ اور بعد میں آنے والے اس کو اپنے احوال و ظروف کے موافق نہ پا کر اس کو یک قلم بدل ڈالیں۔ یہ ساری باتیں ممکن ہیں اور ان میں سے ہر بات مصلحین اور اہلِ حق سے ہوئی ہے اور ہوسکتی ہے اور ان کا ہونا ذرا بھی ان کی شان مصلحیت و مجددیت میں فرق پیدا کرنے والی چیز نہیں ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بڑھ کر حق پر استوار اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن ان سے بھی غلطیاں صادر ہوئیں اور انہوں نے نام لے لے کر خود اپنی غلطیاں گنوائیں کہ میں نے فلاں فلاں کام ایسے کر ڈالے ہیں جن پہ مجھے افسوس اور ندامت ہے، کاش میں نے وہ کام نہ کیے ہوتے۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا کہ فلاں فلاں تدبیروں کے اختیار نہ کرنے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی اور مجھے اس بات کا بڑا پچھتاوا ہے کہ میں نے وہ کام کیوں نہ کیے۔ حضرت ابوبکرؓ کی

صدیقیت کے بعد فاروق اعظم کی محدّثیت سے کون انکار کر سکتا ہے اور ان سے زیادہ شیطان کے فتنوں سے کون محفوظ ہو سکتا ہے جن کا مرتبہ یہ بتایا گیا کہ شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے جدھر سے اُن کا گذر ہوتا ہے۔ تاہم اس کے باوصف یہ واقعہ نہیں ہے کہ انہوں نے جیش اسامہؓ کے معاملہ میں، اہلِ ردہ کے معاملہ میں، جمع قرآن کے معاملہ میں جو رائیں قائم کیں وہ خود اُن کے ارشاد کے مطابق صحیح نہیں تھیں۔ میں نے اِن دونوں بزرگوں کی غیر معمولی عظمت کی وجہ سے ان کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انہی پر دوسروں کو قیاس کیا جائے۔

امام مالکؒ کے بارہ میں کون شک کر سکتا ہے کہ وہ حق پر قائم رہنے والے اور دین کو قائم کرنے والے نہیں تھے؟ لیکن کیا آپ حضرات ان پر تنقید نہیں کرتے؟ حضرت امام شافعیؒ کے ایک عظیم مصلح ہونے میں کون شخص شک لا سکتا ہے؟ لیکن آپ کے عربی مدرسوں میں کیا روزانہ اُن کی فقہ کے بخیے نہیں ادھیڑے جاتے؟ امام احمد بن حنبلؒ کی جلالت مرتبہ اور ان کی شان مجددیت و مصلحیت میں کسے اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے؟ لیکن کیا علمائے دین نے ان کی ساری علمی تحقیقات، اور ان کے تمام اجتہادات کو صحیح و درست مان لیا ہے؟ امام ابن تیمیہ اپنے زمانے کے مجدد اعظم تھے اور ان کے دشمن بھی ان کے اس مرتبہ کا انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن خود مولانا محمد منظور نعمانی نے ان کی سب سے زیادہ بلند پایہ کتاب میں ناصبیت کی جھلک دکھا دی۔

مذکورہ بالا بزرگانِ دین اور اکابرِ ملت میں سے کون ہے جس کا ظاہر علی الحق ہونا ہمارے یہاں مختلف فیہ ہو؟ لیکن اُن میں سے کسی کو بھی ہم معصوم نہیں مانتے۔ پھر اگر ان کو معصوم نہ ماننے سے ان کی عظمت و جلالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، وہ بدستور مصلح اور ظاہر علی الحق باقی رہتے ہیں، ان کے ذریعہ سے دین بھی نکھرتا ہے، ختمِ رسالت کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے اور حدیث لاتزال طائفۃ... الخ کا منشا اور منبیٰ بھی کسی خطرہ میں نہیں پڑتا، تو آخر شاہ صاحبؒ اور مجدد صاحبؒ پر تنقید کر دینے سے کیوں قیامت ٹوٹ پڑے گی اور کیوں حدیث تجدید اور ختمِ رسالت سب کا

انکار لازم آجائیگا؟ ۔ ہم تو اس بات میں ذرا بھی تناقض نہیں پاتے کہ مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ دونوں مجدد بھی ہوں اور اُن سے اُن کے کارِ تجدید میں بعض فروگذاشتیں بھی ہو گئی ہوں۔ ہم تو ان دونوں بزرگوں کے متعلق یہی حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ یہ قیامت کے روز زمرۂ صالحین و مجددین ملت میں ہوں گے اور ان سے جو فروگذاشتیں ہوئی ہونگی اللہ تعالیٰ ان کے حسنِ نیت کے بدلہ میں ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی اجتہادی غلطیوں پر بھی اُن کو اجر دیگا۔

بہرحال جماعت اسلامی کا موقف اس معاملہ میں یہ ہے کہ اس امت کے ہر دَور میں مصلحین و مجددین پیدا ہوتے اور دین کو نکھارتے رہیں گے، لیکن وہ معصوم نہیں ہوں گے بلکہ ان سے ان کے کام میں مختلف قسم کی اجتہادی فروگذاشتیں بھی صادر ہوسکیں گی اور یہ چیز ان کی شان مصلحیت و مجددیت میں کوئی فرق پیدا کرنے والی نہیں ہوگی۔ اُن کے ظاہرین علی الحق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معصوم ہوں بلکہ صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ مُتبعِ ہواء اور اسلام میں جاہلیت کے گھُسانے والے نہ ہوں۔

جماعت اسلامی کے ناچیز کارکن اپنی نسبت بھی یہ گمان نہیں رکھتے کہ ہم سے اس کام میں غلطیاں نہیں ہوسکتیں۔ ہم نے بارہا غلطیاں کی ہیں اور پھر اُن کی اصلاح کی ہے۔ آئندہ بھی ہم سے غلطیوں کا امکان ہے اور ہم ان میں سے جن غلطیوں پر مطلع ہوجائیں گے اِن شاء اللہ ان کی اصلاح کریں گے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ہم اپنی بعض غلطیوں پر آخر تک مطلع نہ ہوسکیں اور اُن پر ہمارے بعد آنے والے صالحین و مصلحین تنقیدیں کریں۔ ہم اپنے آپ کو ہرگز دین کا ایسا نکھارنے والا نہیں سمجھتے کہ ہم سے کوئی غلطی سرے سے ہوگی ہی نہیں۔ اگر ہماری کوئی حقیر خدمت وطغرائے امتیاز نہیں ہے تو بس صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کے پورے دین کی اقامت کے لیے اُٹھے ہیں اور متبع ہواء اور اسلام میں جاہلیت کے گھُسانے والے نہیں ہیں بلکہ مبتدعین نے اسلام میں جو جاہلیت ملائی ہے اس سے اسلام کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا نے اس بحث کے ضمن میں معلوم نہیں دیوبند سے شائع ہونے والے ایک رسالہ کے

ایک مضمون کا ذکر کس مناسبت سے چھیڑا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا اشارہ رسالہ "تجلی" کے اس مضمون کی طرف ہے جس میں دیوبند اور مظاہر العلوم کے مفتیانِ عظام کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون غالباً کوثر کے صفحات میں میری نظر سے گذرا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ مضمون مجھے پسند آیا تھا۔ میں اگرچہ رسالہ تجلی یا اس کے لکھنے والوں کی صلاحیتوں سے کوئی سابقہ واقفیت نہیں رکھتا لیکن یہ مضمون ادبی اعتبار سے بھی اچھا تھا اور ایک اچھے رجحانِ فکر کا بھی پتہ دے رہا تھا۔ اس سے میں نے یہ خوشگوار نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دیوبند میں سارے ہی استاد پرست اور گروہی تعصبات کے مریض نہیں ہیں، بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد حق پرست اور انصاف پسند لوگوں کی بھی موجود ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے کوثر نے اپنے صفحات میں اس مضمون کو جگہ دی ہوگی، نہ اس لیے کہ جماعت اسلامی کسی سند کی بھوکی تھی اور یہ مضمون سامنے آتے ہی مدیر کوثر نے بیتاب ہو کر اسے ایک "آسمانی شہادت" سمجھتے ہوئے اپنے صفحات میں نقل کر لیا۔ اگر مولانا محمد منظور صاحب ہم لوگوں کو کچھ بھی جانتے ہیں تو وہ اس بات سے بے خبر نہ ہونگے کہ مذمتوں اور تعریفوں سے اثر لینے کے معاملہ میں ہمارا کیا حال ہے۔

مولانا کو اگر "تجلی" کے اس مضمون کی بے لاگ صداقت سے تکلیف ہوئی ہے تو اس کی سزا اس مضمون کے لکھنے والوں اور شائع کرنے والوں کو دینی تھی۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مضمون تو کسی نے لکھا اور اس کی سزا جماعت کو دی جا رہی ہے۔ حالانکہ جماعت کا جرم صرف یہ ہے کہ اس کے اخبارات نے اس مضمون کو اپنے صفحات میں جگہ دے دی۔ ذرا مولانا کے تیور ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں ؏ "اگر واقعتہً جماعت اسلامی وہی چاہتی ہے جو اس مضمون میں کہا گیا ہے تو پھر تو اس کا راستہ روکنا اور اس کی مخالفت کرنا مجھ جیسوں کے نزدیک بھی فرائض میں سے ہوگا۔" اگر جاں بخشی ہو تو میں جواب میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ جماعت نے جہاں تک اپنے مقاصد کی ترجمانی کا تعلق ہے، اپنے "الماری بھر دینے والے" لٹریچر میں خود ہی کر دی ہے۔ اس کام کو اس نے رسالہ تجلی کے سپرد نہیں کیا ہے۔ لیکن میں تجلی کے مضمون نگار کی یہ بڑی حق تلفی سمجھتا ہوں کہ محض اس

اندیشے کی وجہ سے کہ اس کے مضمون کی تعریف سے مولانا ناخوش ہو جائیں گے اور جماعت کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھنے لگیں گے اس کے مضمون کی تعریف نہ کی جائے۔ وہ مضمون نہایت خوب تھا اور نہایت ہی عمدہ اسلوب سے اس میں مفتیانِ کرام کو نہایت مفید مشورے دیے گئے تھے۔ مولانا کو چاہیے کہ اس سے برہم ہونے کے بجائے خود بھی اس سے فائدہ اُٹھائیں اور دیوبند اور مظاہر العلوم کے مفتیوں کو بھی اس کی مفید نصیحتوں سے فائدہ اُٹھانے کا مشورہ دیں۔ بڑوں کی نادانیوں پر اگر اپنے ہی گھر کے چھوٹے ٹوک دیا کریں تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟ وہ مضمون ہمارے لیے کچھ ایسا مفید نہیں تھا جتنا وہ خود آپ حضرات کے لیے مفید ہے۔ اب اگر محض اس غصہ کے سبب سے کہ جماعت اسلامی کے اخباروں نے اپنے صفحات میں اس کو نقل کر دیا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو یہ پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا لینے کے ہم معنی ہو گا۔

میں نے مضمون کے متعلق اپنی یہ ناچیز رائے محض اس خیال سے یہاں ظاہر کر دی ہے کہ مولانا نے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر جماعت کے ذمہ دار لوگوں نے اس مضمون سے اپنی برأت کا اعلان نہ کیا تو وہ جماعت کی مخالفت کرنا اپنے لیے فرض سمجھیں گے۔ میں اس کے جواب میں نہایت ادب سے یہ گذارش کرتا ہوں کہ اگر وہ اس ناچیز خادم کو کسی درجہ میں جماعت کا کوئی ذمہ دار آدمی سمجھتے ہیں تو لیجیے، میں نے یہ اظہارِ رائے کر دیا ہے۔ اب مولانا اپنا فرض ادا کرنے میں ہرگز تامل نہ فرمائیں۔

(۵)

مولانا کو پانچویں شکایت جماعت اسلامی سے یہ ہے کہ اس نے پورے دین کی اقامت کی جدوجہد کا شرف تن تنہا اپنے لیے مخصوص سمجھ رکھا ہے، کسی اور جماعت کو اس شرف میں اپنا شریک و سہیم تسلیم کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔ مولانا کا دعویٰ یہ ہے کہ اُن کی تبلیغی جماعت بھی اس شرف کی حق دار ہے۔ البتہ اس کا طریقۂ کار جماعت اسلامی کے طریقۂ کار سے مختلف ہے۔ اس نے اپنے لیے حضرت امام حسنؓ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے طریقوں کو زیادہ لائقِ اتباع سمجھا ہے۔

اگر تبلیغی جماعت پورے دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کر رہی ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس راہ میں کچھ اور ہم سفر بھی ساتھ ہیں۔ ہم نے تبلیغی جماعت کی مخالفت کو نہ کبھی پہلے پسند کیا ہے اور نہ اب پسند کرتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش برابر یہی رہی ہے اور یہی ہے کہ اس نے اپنے لیے جس طریق کو بھی پسند کیا ہے اس طریق پر کام کرتی رہے۔ ہم اس کے کام کو اپنے مقصد کے لیے مددگار خیال کرتے ہیں نہ کہ اس کا مخالف۔ ہمارا تعلق اس جماعت سے شروع سے ہمدردانہ رہا ہے اور اب تک ہمدردانہ ہی ہے۔ اس تحریک سے ہماری دلچسپی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے کے لیے مولانا مودودی نے خود علاقہ میوات کا دورہ کیا اور پھر پڑھی لکھی پبلک میں نہایت عمدہ اسلوب سے اس تحریک کا تعارف کرایا۔ بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ وہ پہلے شخص ہیں جن کے ذریعہ سے یہ تحریک میوات سے باہر کی پبلک میں متعارف ہوئی۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا بھی اچھی طرح علم ہے کہ اس کام میں جو نقائص تھے مولانا مودودی نے شروع ہی میں وہ محسوس کر لیے تھے، لیکن اُن کا ذکر انہوں نے صرف مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم سے تنہائی میں کیا، پبلک میں ان باتوں کا ذکر نہ اس وقت پسند کیا تھا نہ اس کے بعد کبھی پسند کیا۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اسی روش پر قائم رہے۔ لیکن پھر معلوم نہیں کن لوگوں نے یہ وسوسہ اندازی شروع کر دی کہ جماعت اسلامی کا کام انبیاء علیہم السلام کے طریقہ سے ہٹا ہوا ہے۔ انبیاءؑ کتابیں لکھ لکھ کر نہیں چھپایا کرتے تھے۔ وہ تو ایک ایک شخص کے پاس پہنچ کر اُس کو تبلیغ کیا کرتے تھے۔ جماعت اسلامی تو بس تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگوں کے اندر اپنا لٹریچر فروخت کر رہی ہے۔ اصلاح کا اصلی محتاج تو عوام الناس کا گروہ ہے، لیکن جماعت اسلامی کو اُن کی سرے سے کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کا کام تو تقویٰ کی روح سے خالی ہے، اگر تقویٰ کی بہار دیکھنی ہو تو مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے تبلیغی وفود کے ساتھ نکلو اور تقویٰ کی بہار دیکھو۔ جماعت اسلامی نے تو سیاست میں ٹانگ اڑانی شروع کر دی ہے اور اس نے خواہ مخواہ کو اپنی ایک

پارٹی بنائی ہے۔ ہم کو کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے، جس کا جی چاہے کانگریس میں شریک ہو اور جس کا جی چاہے مسلم لیگ میں شریک ہو جائے، ہم تو بس تبلیغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نے بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ بعض نیک بختوں نے یہ تک کہنا شروع کر دیا کہ اصلی چیز تو اخلاص و تقویٰ ہے، اگر اس کی دولت موجود ہو تو آدمی ہر نظام کی نوکری اور تابعداری کر کے ندا رسیدہ بن سکتا ہے ——— اس طرح کی باتیں جب ہمارے ارکان کے کانوں میں مسلسل پڑنی شروع ہوئیں تو ہمارے ارکان نے ان امور کی بابت ہم سے سوالات کرنے شروع کیے۔ تب مولانا مودودی صاحب کو ان معاملات میں جماعت کا موقف واضح کرنا پڑا اور پھر مجھے بھی انبیاء کے طریقِ دعوت کے سلسلہ میں بعض ضروری پہلوؤں کی خالص علمی نقطۂ نظر سے تشریح کرنی پڑی۔

اپنا پوزیشن واضح کرنا ضروری ہو چکا تھا اس لیے ہم نے واضح کر دیا۔ تاہم اُس وقت بھی ہماری دلی خواہش یہی تھی اور آج بھی یہی ہے کہ ان دونوں خادم دین جماعتوں کے کارکنوں میں کسی جگہ بھی کشمکش نہ ہو۔ لیکن مولانا محمد منظور صاحب نے ہماری اس روش کو پسند نہیں فرمایا۔ پہلے وہ درپردہ جماعت اسلامی کے خلاف وسوسہ اندازیاں کرتے رہے، اور اب انہوں نے کھل کر اپنے اعتراضات پبلک میں شائع کر دیے ہیں تاکہ ہر جگہ تبلیغی جماعت کے ارکان جماعت اسلامی کی "گمراہیوں" پر پوری تیاری کے ساتھ خطبہ دے سکیں۔ اہلِ تقویٰ کے کام کرنے کے ڈھب یہ ہوتے ہیں!

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مولانا نے اپنی جماعت کے موقف کو بدل کیوں دیا؟ اب تک تو یہ کہا جاتا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کے طریق پر تبلیغ صرف تبلیغی جماعت ہی کرتی ہے لیکن اب مولانا نے پہلی مرتبہ یہ انکشاف فرمایا ہے کہ تبلیغی جماعت نے اپنے لیے حضرت امام حسنؓ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے تجربات کو لائقِ اتباع سمجھا ہے۔ اگر یہ تجربات انبیاء کے طریقہ سے الگ نہیں ہیں تو موقف بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر اُس سے الگ ہیں تو میں مولانا کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ کتاب و سنت کی کسوٹی پر اچھی طرح اس کو پرکھ لیں۔ ممکن ہے یہ اتباع اسی

طرح کی اتباع ہو جس طرح کی اتباع ایک پیرزادہ صاحب نے تصورِ شیخ کے معاملہ میں مجدد صاحب کی کی ہے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں نے تو یہ بات کچھ اور کہی ہو لیکن وہ کچھ کی کچھ بنا دی گئی ہو۔ مجھے امید ہے کہ مولانا میری اس گذارش کو برا نہ مانیں گے۔

بہر حال مولانا سے ہماری گذارش یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو جاری رکھیں۔ اگر وہ پورے دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو ہم اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خدمات کا صلہ دیگا، وہ خدا کے یہاں ہمارے سرٹیفکیٹ کے محتاج نہ ہوں گے۔ اور اگر وہ پورے دین کی خدمت نہیں کر رہے ہیں جب بھی بددل اور آزردہ خاطر نہ ہوں، خدا کے دین کی جتنی خدمت بھی وہ کریں گے وہ خدا کے دین ہی کی خدمت ہوگی، بشرطیکہ وہ دین کے دوسرے خادموں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

(۶)

چھٹا الزام مولانا نے جماعت کے ذمہ داروں پر تصوف سے محرومی اور بے خبری کا لگایا ہے۔ یہ الزام اس سے پہلے جناب حکیم عبدالرشید محمود صاحب بھی اپنے مضمون میں لگا چکے ہیں اور ہماری طرف سے انہی صفحات میں اس کا جواب بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کا طرزِ استدلال جناب حکیم صاحب قبلہ کے مضمون سے بہت آگے ہے۔ میں مولانا کے مضمون کے غیر ضروری حصوں کو نظر انداز کر کے صرف ان کی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

مولانا کا گمان ہے کہ جماعت اسلامی کے اہلِ قلم تصوف پر تنقید تو بڑی بے باکی سے کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو تصوف کی معمولی ابتدائی باتوں کا بھی پتہ نہیں ہے۔ مولانا کا دعویٰ ہے کہ یہ بات وہ اپنے ذاتی تجربہ اور ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مولانا کی یہ رائے نہایت غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ جماعت کے اندر سارے آدمی ایک ہی مذاق اور ایک ہی طبیعت کے نہیں ہیں۔ ممکن ہے جماعت کے بعض اہلِ علم کو تصوف سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو اور انہوں نے اس فن کو کتاب و سنت سے بے تعلق سمجھ کر سرے سے

اس کو ہاتھ ہی نہ لگایا ہو۔ لیکن اس سے یہ قیاس کر لینا کہ جماعت کے اندر سب ایک ہی مذاق کے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کسی فن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس فن کی تمام اَلَم غَلَم چیزیں پڑھی جائیں بلکہ اس مقصد کے لیے یہ کافی ہے کہ اس فن کی بعض امہاتِ کتبِ تنقید کے ساتھ پڑھ لی جائیں۔ اگر ایک آدمی ذہین اور نقاد ہو تو اتنے ہی سے وہ پورے فن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیتا ہے اور اگر اس میں نقد کی صلاحیت نہ ہو تو وہ ایک چیز پر پوری زندگی کھپا کر بھی اس سے بالکل کورا ہی رہتا ہے۔

مجھے اپنی ذات کی نسبت یہ اعتراف ہے کہ میں نے اس فن کا کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے اس فن کی کوئی چیز سرے سے پڑھی ہی نہیں ہے اور اس کی الف، ب جانے بغیر ہی اس پر تنقید شروع کر دی ہے تو اس کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس فن کی معتبر کتابوں میں سے رسالہ قشیریہ کو بار بار پڑھا ہے۔ میں نے ابوطالب مکی کی قوت القلوب اس اہتمام کے ساتھ پڑھی ہے کہ میں معمولی تیاری سے اس کی خلافِ کتاب و سنت باتوں پر ایک مقالہ املا کرا سکتا ہوں۔ میں نے امام غزالیؒ کی احیاء العلوم سطر سطر پڑھی ہے اور ایک زمانہ میں یہ کتاب مجھے بہت محبوب رہی ہے اور اب بھی مجھے ادبی اعتبار سے پوری کتاب اور فکری اعتبار سے اس کے بعض مباحث سے بڑی دلچسپی ہے میں نے علامہ ابن قیمؒ کی ضخیم اور عظیم الشان کتاب مدارج السالکین دو مرتبہ نہایت اہتمام کے ساتھ حرف بحرف پڑھی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کی الفوائد، جو تصوف میں ہے، مجھے اس قدر پسند رہی ہے کہ میں ایک زمانہ میں اس کے مطالب ترتیب کے ساتھ اہلِ ذوق احباب کو زبانی سنایا کرتا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے بعض رسائل بھی میری نظر سے گذرے ہیں۔ کچھ دنوں مثنوی مولانا روم سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ دیوان حافظ کو میں نے بار بار نہایت ذوق سے پڑھا ہے اور چونکہ میرے استاد مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں کے بڑے مخالف تھے جو خواجہ صاحب کو مستِ بادۂ انگور خیال کرتے تھے اس لیے میں نے بھی خواجہ صاحب کے کلام کو کلام معرفت ہی

کے پہلو کو سامنے رکھ کر پڑھنے کی کوشش کی۔ مجھے رواقیین (STOICS) کے فلسفہ اور تصوّف سے ایک زمانہ میں اتنی دلچسپی رہی ہے اور انگریزی زبان کے واسطہ سے مَیں نے اس کو اس قدر پڑھا ہے کہ اگر قرآن حکیم نے مجھے بچایا نہ ہوتا تو میں بہت سی گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ مَیں نے یوگا کی بھی بعض کتابیں پڑھی ہیں اور ہمارے تصوف میں اس کے جو اجزاء شامل کیے گئے ہیں مَیں ان کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔

مَیں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا یہ مطالعہ اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ مَیں ایک پیر و مرشد بن کر بیٹھ جاؤں اور لوگوں کو تصوف کے اسرار و رموز بتانے شروع کر دوں۔ لیکن کیا یہ اس بات کے لیے بھی کافی نہیں ہے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ تصوف کا کتاب و سنت سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور وہ ہمارے لیے کوئی مفید شے ہے یا مضر چیز ہے؟

مولانا نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ تصوف کو اگر کوئی شخص کتابوں میں پڑھ بھی لے جب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ دنیا کی ان حقیقتوں میں سے ہے جو الفاظ کے معنی جان لینے سے ادراک کی گرفت میں نہیں آتیں۔ بلکہ یا تو یہ آدمی کو خود نصیب ہوتی ہیں یا پھر آدمی کسی دوسری زندہ ہستی میں ان کا مشاہدہ کرتا ہے تب کچھ سمجھ میں آتی ہیں۔

مولانا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے تصوف کا پوری تفصیل کے ساتھ مطالعہ بالفرض کیا بھی ہو جب بھی ہمیں اس کے متعلق زبان کھولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہمیں یہ چیز خود نصیب ہوئی ہے اور نہ ہم نے اس کا کسی زندہ ہستی میں مشاہدہ ہی کیا ہے۔ خود نہ حاصل ہونے کی وجہ تو غالباً یہ ہے کہ زعفران کی طرح تصوف کے بھی پیدا ہونے کا ایک خاص علاقہ ہے، اس دائرہ سے باہر اس کا اُگنا ناممکن ہے۔ جو لوگ اس رقبہ مخصوص میں بستے ہیں بس انہی کے قلوب صافی میں یہ چیز اُگ سکتی ہے۔ باقی رہا کسی زندہ ہستی کا سوال جس کے اندر تصوف کی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا جا سکے، تو اس چیز کا اب کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا، کیونکہ مولانا مجھے خود اپنے ایک گرامی نامہ میں، ابھی حال ہی میں، یہ لکھ چکے ہیں کہ

اس قسم کی ہستی بس ایک ہی تھی اور وہ اُٹھ گئی۔ مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ ہستی اگر موجود ہوتی تو وہ مجھ کو اور مودودی صاحب کو لے جا کے تصوف کی زندہ حقیقت دکھا لاتے۔ بہر حال اب چونکہ وہ واحد ہستی بھی موجود نہیں رہی اس لیے تصوف کے بارہ میں کفِ لسان کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں باقی رہا۔ تصوف کو الفاظ سے سمجھا نہیں جا سکتا اور کوئی ایسی ہستی اب، خود مولانا کے بقولؔ موجود نہیں رہی جس کی زندگی کے اندر اس کے جلوے دیکھے جا سکیں۔ ع

اب کسے رہنما کرے کوئی!

مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ آخر تصوف ہی کی یہ خصوصیت کیوں ہے کہ اس کو بس کسی زندہ آدمی ہی کے اندر دیکھا جا سکتا ہے، اس کے بغیر اس کی حقیقت نہیں جانی جا سکتی؟ اگر ایک طالب حقیقت اللہ کی کتاب کو سمجھ سکتا ہے، اگر ایک سلیم الطبع آدمی رسول اللہ کی حدیثیں کو سمجھ سکتا ہے اور تصوف کے مدعیوں سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھ سکتا ہے، تو آخر تصوف ہی کے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اس کو نہیں سمجھا جا سکتا؟ اگر یہ تصوف قرآن وحدیث ہی سے نکلا ہوا ہے تو اس کو سمجھ میں آنا چاہیے۔ لیکن اگر قرآن اور حدیث سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر بہتر ہے کہ یہ نہ سمجھ میں آئے۔ ایک مسلمان کا اُس چیز سے محروم ہی رہنا اچھا ہے جو قرآن اور حدیث سے بے تعلق ہے۔ ہمارے نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔ یہ آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ وہ غیر متعلق باتوں میں نہ پڑے۔

مولانا نے اس مضمون کے اس حصہ میں اپنے بعض ذاتی تجربات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربات کو لائق ذکر تو نہیں سمجھتا لیکن مولانا اجازت فرمائیں تو میں بھی اپنا ایک ذاتی تجربہ عرض کرنے کی جرأت کروں۔

میں نے آج تک جتنے آدمی بھی خانقاہی طریق پر تربیت پائے ہوئے یا خانقاہی طریق پر تربیت کرنے والے دیکھے ہیں ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس میں میں نے وہ باتیں محسوس کی ہوں جن کو مولانا تصوف کا خاصہ بتاتے ہیں۔ بعض اشخاص کی ظاہری دینداری سے

میں وقتی طور پر اگر متاثر بھی ہوا تو میں نے دیکھا کہ دوسرے پہلوؤں سے وہ بہت خام ہیں۔ میرے علم میں متعدد ایسے اشخاص بھی ہیں جو خانقاہی تزکیہ سے پہلے نہایت معقول قسم کے آدمی تھے لیکن خانقاہی تزکیہ کے کورس سے گذرنے کے بعد وہ بالکل مصنوعی قسم کے آدمی بن کے رہ گئے۔ یہ میں عام آدمیوں کی باتیں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ان لوگوں کی باتیں کر رہا ہوں جن کو بڑا سمجھا جاتا ہے۔ ہاں ایک اور صرف ایک شخص کو دیکھا ہے جو اُن تمام خصوصیات کا صحیح طور پر حامل تھا جو مولانا تصوف کی بتاتے ہیں لیکن میں بالیقین جانتا ہوں کہ اس کے اندر یہ خوبیاں تصوف کی راہ سے نہیں آئی تھیں بلکہ تدبرِ قرآن اور اتباعِ سنت کی راہ سے آئی تھیں۔ افسوس ہے کہ یہ ہستی بھی اُٹھ گئی ورنہ میں مولانا کو دکھاتا کہ تصوف کے بغیر دنیا میں ایسے ایسے اہلِ کمال پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا کو یہ بھی شکایت ہے کہ ہم نے تصوف کے خلاف جو باتیں لکھ دی ہیں ان کا اثر یہ ہوا ہے کہ جو باتیں مجدد صاحبؒ، شاہ صاحب، سید صاحب رحمتہ اللہ علیہم کے سلسلہ سلوک کے اشغال و اعمال میں داخل ہیں جماعت اسلامی کے لٹریچر کے تیار کیے ہوئے "محققین" و "مجتہدین" ان کو بھی بدعت و ضلالت قرار دے دیتے ہیں۔

مولانا کا یہ اعتراض پتہ دیتا ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز کتنا غلط واقع ہوا ہے۔ میں ان کی غلطی کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے یہاں ایک بات بطور مثال ذکر کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک پیرزادہ صاحب کا ایک مضمون انہی صفحات میں میرے جواب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پیرزادہ صاحب نے اپنے مضمون میں تصوف کی برکات پر بحث فرماتے ہوئے ایک جگہ "تصورِ شیخ" کا بھی ذکر فرمایا اور اس کی ایک عجیب و غریب توجیہ پیش کی۔ میں نے اس توجیہ پر تنقید کی اور یہ ثابت کیا کہ اگر تصورِ شیخ کی توجیہ یہی ہے تو اس کے خلاف کتاب و سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اس کے دلائل یہ یہ ہیں۔ میرے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مولانا محمد منظور صاحب نے مجھے ایک مفصل خط لکھا جس میں مجھے اُن خیالات کے اظہار پر نہایت سخت ملامت

کی جو میں نے تصورِ شیخ کے بارے میں ظاہر کیے تھے۔ اور فرمایا کہ تم سے بڑی ہی سخت غلطی ہو گئی ہے، فوراً توبہ کرو اور اپنے ان خیالات سے رجوع کا اعلان کرو۔ نہیں پتہ نہیں ہے کہ تصورِ شیخ کے قائل تو شاہ صاحبؒ اور مجدد صاحبؒ بھی رہے ہیں، تم نے ان بزرگوں کو بھی کافر بنا ڈالا! کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ حضرات "حقیقتِ شرک" اور "حقیقتِ توحید" کے مصنف کے برابر بھی شرک و توحید کے امتیاز کو نہیں سمجھتے تھے؟

میں مولانا کے ساتھ ایک مدت سے حسنِ ظن ہی نہیں بلکہ محبت بھی رکھتا ہوں لیکن ان کے اس خط کو پڑھ کر ان کے اس سوچنے کے انداز سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ چند اشخاص کی طرف جو کچھ منسوب کر دیا جائے اور جن توجیہات کے ساتھ بھی منسوب کر دیا جائے اس کو وہ بے تکلف ایک ثابت شدہ حقیقت کی طرح مان لیتے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ تصورِ شیخ مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں مذکور بھی ہو تو اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ ان کے نزدیک اس کی وہی توجیہ بھی رہی ہو جو پیرزادہ صاحب نے پیش کی تھی؟ اور اگر خدانخواستہ شاہ صاحبؒ اور مجدد صاحبؒ اسی توجیہ کے ساتھ اس کو اختیار کیے ہوئے تھے جس توجیہ کے ساتھ پیرزادہ صاحب نے اس کو پیش کیا تھا اور اس بات کی ان دونوں بزرگوں کی کتابوں سے تصدیق بھی ہوتی تھی، تو ایک سچے مسلمان کے لیے اس معاملہ میں کیا رویہ صحیح تھا؟ کیا یہ کہ محض اس بنیاد پر کہ یہ بات شاہ صاحبؒ اور مجدد صاحبؒ نے لکھ دی ہے وہ اس کو مان لیتا، یا یہ کہ وہ ظاہر کتاب و سنت پر قائم رہتا اور یہ خیال کرتا کہ اس معاملہ میں ان بزرگوں سے یا تو مسامحت ہو گئی ہے یا کم از کم یہ کہ ان کی دلیل قابلِ اطمینان نہیں ہے اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے؟ میرے نزدیک ایک خدا پرست اور متبعِ سنت مسلمان کے لیے صحیح ایمانی روش یہی دوسری ہے۔ لیکن مولانا نے محض اس دلیل کی بنا پر کہ یہ بات شاہ صاحبؒ اور مجدد صاحبؒ کے سلوک میں موجود ہے ایک صریح ضلالت کے قبول کرنے پر مجھ سے اصرار کیا اور یہ توفیق آخر وقت تک انہیں نہ ہوئی کہ تصورِ شیخ کی کوئی ایسی توجیہ پیش کرتے جس کو ایک مسلمان توحید پر قائم رہتے ہوئے قبول کر سکتا ہو۔ یہ تو اللہ کی مہربانی ہوئی کہ مولانا ہی کے ایک بزرگ نے میری تائید کر دی

اور میری جان چھوٹی ورنہ ایک اور فتوائے تکفیر کے لیے سامان فراہم ہو چکا تھا۔ یہاں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تصورِ شیخ کی جو توجیہ حال میں مولانا ظفر احمد صاحب نے پیش کی ہے میں اس کو بھی پیرزادہ صاحب کی توجیہ سے کم غلط نہیں سمجھتا، لیکن چونکہ میں ان مسائل کو غیر ضروری خیال کرتا ہوں اس لیے ان پر صرفِ وقت کو پسند نہیں کرتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی اُٹھائی ہے کہ جماعت اسلامی کسی ایسے شخص کو اپنے دائرہ میں نہیں لیتی جو کسی سلسلۂ سلوک سے انتساب اور کسی صاحب ارشاد شیخ سے اصلاح و تربیت کا تعلق رکھتا ہو۔ اور پھر اس پر یہ دلچسپ سوال پیدا کیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آج مجدد صاحبؒ، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اس دنیا میں ہوتے تو اپنے اس "گناہ" اور "قصور" کی وجہ سے وہ بھی جماعت اسلامی کی رکنیت کے لائق نہ سمجھے جاتے۔

جہاں تک جماعت کی رکنیت کے معاملہ کا تعلق ہے مولانا اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ دستورِ جماعت میں رکنیت کی تمام ضروری شرطیں بیان کر دی گئی ہیں۔ ہر شخص جو اُن شرطوں کو پورا کر سکے وہ جماعت کا رکن ہو سکتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو۔ اگر ایک شخص کسی سلسلۂ سلوک کے ساتھ انتساب رکھتا ہے یا کسی شخص سے اصلاح و تربیت کا تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ انتساب و تعلق نہ اس کے لیے جماعتی دستور کے مطالبات کی تکمیل میں مانع ہوتا ہے نہ اس کو جماعتی دستور کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے، تو وہ شخص جماعت کا رکن بن سکتا ہے۔ البتہ یہ بات بالکل مہمل ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو بیعتوں کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لے درآنحالیکہ ایک کے مطالبات دوسرے کے اکثر معاملات سے متصادم ہوں۔ پیری مریدی کے نظام میں یہ دوعملی چل سکتی ہے اور چلتی رہتی ہے لیکن جو جماعت دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے برپا کرنے کے لیے بنائی گئی ہو اس میں یہ اعجوبہ کاروبار کس طرح چل سکتا ہے کہ ایک شخص بیعت تو کسی سے کرے اور اطاعت کسی اور کی کرے۔ اس طرح کی باتیں اُن نظاموں میں چلتی ہیں جو دین و دنیا کی تفریق کے نظریہ پر قائم ہیں، جماعتِ اسلامی کا پورا نظام اس تفریق کے بالکل خلاف ہے۔

یہ مولانا کے اصل اعتراض کا جواب تھا۔ رہی یہ بات کہ اگر مجدد صاحبؒ، شاہ صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل شہید اس زمانہ میں ہوتے تو وہ اپنے اس "قصور" کے ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کے رکن بن سکتے یا نہیں، تو مولانا اس سوال کے جواب کے لیے پریشان نہ ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ بزرگان دین موجود ہوتے تو وہ موجودہ زمانہ کی پیری مریدی کے لاطائل جھمیلوں میں پڑنے کے بجائے انشاءاللہ جماعت اسلامی قائم کرتے اور انہی طریقوں پر مسلمانوں کی اصلاح کرتے جن طریقوں پر ہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ البتہ آپ کے مدرسوں اور خانقاہوں سے ان کی وہی توقع ہوتی جو آج ہماری ہو رہی ہے۔

مولانا نے ہم لوگوں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تصوف کی جتنی ضرورت تم لوگوں کو ہے اتنی ضرورت دوسروں کو نہیں ہے۔ تم اقامتِ دین کی جس مہم کو لے کر کھڑے ہوئے ہو، اس کے کارکنوں میں یقین و توکل اور عشق و جنون کے جو اوصاف مطلوب ہیں وہ صرف تصوف ہی کی راہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

میں نے مولانا کی اس قیمتی نصیحت پر بار بار غور کیا اور چونکہ میں ان سے حسن ظن اور محبت رکھتا ہوں اس لیے مجھے کبھی کبھی یہ شبہ بھی لاحق ہوا کہ ممکن ہے مولانا ایک صحیح بات کہہ رہے ہوں اور ہم اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں ایک ایسی چیز سے غفلت برت رہے ہوں جو اس راہ میں ضروری ہو۔ لیکن اب مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ تصوف ہمارے اس کام کے سلسلہ میں ذرا بھی ضروری نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدمی اگر اقامت دین کی جدوجہد میں خلوص کے ساتھ لگ جائے تو اس راہ کی سرگرمیاں اور اس کے تجربات خود اس کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر آدمی بنا دیتے ہیں جو ہماری خانقاہوں میں تیار ہوتے ہیں۔ میرے پاس اس دعوے کا نہایت ناقابل تردید ثبوت موجود ہے۔ جن حضرات نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تکفیر کے فتوے دیے ہیں اُن کے ناموں کی طول طویل فہرست پر نگاہ ڈالیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ اُن میں ایک شخص بھی غالباً ایسا نہیں ہے جس نے خانقاہی طریق پر تربیت نہ پائی ہو۔ انہوں نے صرف تربیت ہی نہیں پائی ہے بلکہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ایک مدت دراز سے لوگوں کا تزکیہ بھی کر رہے ہیں اور ایک خلق

کثیر تہذیب اخلاق اور اصلاح نفس کے ارادہ سے ان کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے بجا طور پر ان حضرات سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ایک نہایت اہم قدم اُٹھاتے ہوئے یہ حضرات کچھ ذمہ داری اور خوفِ آخرت کا ثبوت دیں گے۔ لیکن ان حضرات نے ایک خادم دین مسلمان کو کافر بنانے اور ایک خادمِ دین جماعت کو ضالّ و مضلّ ٹھہرانے کے لیے جس بیدردی کے ساتھ اس کے کلام کو توڑا مروڑا ہے، جس بددیانتی کے ساتھ اس کی عبارتوں میں تحریف کی ہے، جس عرق ریزی کے ساتھ اس کے ایمان پرور کلام میں کفر کے معنی پیدا کیے ہیں، جس کھینچا تانی کے ساتھ اس کی طرف وہ باتیں منسوب کی ہیں جن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا اور پھر جس شریفانہ زبان میں فتوے مرتب فرمائے ہیں، اس سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ یہ خانقاہی طریق تربیت آدمی کو بنانے کے بجائے اور زیادہ بگاڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس ان لوگوں کو دیکھیے جن پر خانقاہی تربیت کا پرچھاواں بھی نہیں پڑا ہے۔ میرا اشارہ مولانا ابواللیث صاحب اور مولانا مودودی صاحب کی طرف ہے۔ ان حضرات نے جس تحمل اور وقار کے ساتھ اس ہنگامۂ تکفیر و تفسیق کا سامنا کیا ہے اور انتہائی رنجیدہ اور اشتعال انگیز رویہ کے مقابلہ میں جس صبر، جس رزانت، جس شرافت لہجہ اور کظم غیظ اور عفو عن الناس کا مظاہرہ کیا ہے کیا کوئی شخص اُس کا انکار کر سکتا ہے؟ پھر بتائیے کہ اگر مودودی صاحب اور ابواللیث صاحب آپ کے مزکّیوں اور مزکاؤں کے مقابل میں سخط و رضا دونوں حالتوں میں سچائی اور انصاف پر قائم رہنے میں بہتر آدمی ثابت ہو سکتے ہیں درآنحالیکہ انہوں نے ایک دن بھی خانقاہی طریق پر تربیت نہیں پائی ہے تو آخر یہ تصوف ہے کس مرض کی دوا؟ اور اس کو کس غرض کے لیے اختیار کیا جائے؟ اور پھر یہ فرمائیے کہ تصوف کا جو کاروبار اتنے وسیع پیمانہ پر مدتہائے دراز سے جاری ہے، لیکن خود آپ کے ارشاد کے مطابق آج ایک زندہ شخص بھی ایسا موجود نہیں ہے جس کو آپ تصوف کے نمونہ کی حیثیت سے پیش کر سکیں تو آخر اس کاروبار کو مزید جاری رکھنے کا حاصل کیا؟ آپ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ دس سال کے تجربہ کے بعد بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں۔ ہماری آنکھیں تو کھل چکی ہیں۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس قلیل مدت میں

جو حقیر خدمت اقامتِ دین کی انجام پائی ہے اس نے آج ہزاروں انسان ایسے تیار کر دیے ہیں جو اپنے روزمرہ معاملات زندگی میں اُس سے کہیں زیادہ خوفِ آخرت کا لحاظ رکھتے ہیں جتنا آپ کے مفتیانِ دین فتویٰ لکھنے میں رکھتے ہیں۔ برعکس اس کے تصوف کے حاصل کا حال یہ ہے کہ آپ آج ایک شخص کو بھی نہیں پیش کر سکتے جس پر آپ کو اطمینان ہو کہ یہ تصوف کی برکات کا نمونہ ہے۔ پھر یہ مدتوں کا لاحاصل تجربہ آخر آپ حضرات کی آنکھیں کیوں نہیں کھولتا؟

(۷)

آخری اعتراض مولانا نے جماعت کے اس اصول پر کیا ہے کہ جماعت ہر اس نظام حکومت سے تعاون کو حرام قرار دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی نہ ہو۔ مولانا نے اس اصول پر اعتراض کرتے ہوئے جہاں بعض شرعی دلائل اپنے خیال کی حمایت میں پیش کیے ہیں وہاں خود اپنے متعلق یہ ظاہر فرمایا ہے کہ انہوں نے شروع ہی میں مولانا مودودی سے اس مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تھی اور اس وقت یہ طے ہو گیا تھا کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت سے تعاون نہ کرنا اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لیے ضروری تو قرار دیا جائے گا لیکن اس مسئلہ کو شرعی حیثیت نہیں دی جائے گی، لیکن نہ معلوم دستور میں پھر یہ چیز مسئلہ کی نوعیت سے کس تغافل کی وجہ سے رہ گئی۔

مولانا نے جس دستوری تسامح کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنی اور مولانا مودودی کی جس باہمی قرارداد کا حوالہ دیا ہے راقم کو اس کے بارہ میں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ کیونکہ راقم جماعت کے پہلے اجتماع میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں یہاں مولانا مودودی صاحب کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو انہوں نے حال میں اس معاملہ کے متعلق ایک مستفسر کو لکھا ہے۔ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"جماعت اسلامی کے قیام سے پہلے اس کے دستور العمل کا ایک خاکہ مرتب کیا گیا تھا اور وہ ان تمام لوگوں کے پاس غور و خوض کے لیے بھیجا گیا تھا جو اس وقت ترجمان القرآن کی دعوت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن میں ایک مولانا منظور صاحب بھی تھے۔ اس مسودۂ دستور میں عقیدۂ توحید کی تشریح چند فقرات میں کی گئی تھی جن

میں سے پانچواں فقرہ یہ تھا:۔

(اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرے۔ کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے۔ کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے۔ اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں۔ کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا)

یہ فقرہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کو ماننے کے لوازم میں شامل تھا اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس فقرے پر مولانا محمد منظور صاحب کی طرف سے میرے پاس کوئی اعتراض نہیں آیا بلکہ اس وقت مولانا خود بھی پورے زور کے ساتھ ایمان باللہ کے لوازم میں اس کو بیان فرمایا کرتے تھے۔

پھر اگست ۱۹۴۱ء میں میرے ہاں ہندوستان بھر سے ۷۵ اصحاب تشریف لائے جو اس مسودے کو پسند کرکے تشکیل جماعت پر آمادہ تھے۔ اس ابتدائی اجتماع میں مولانا محمد منظور صاحب بھی شریک تھے۔ وہاں اس مسودہ کو لفظ بلفظ پڑھا گیا اور اس میں ضروری ترمیمات کی گئیں۔ پھر ترمیم شدہ دستور کو تمام حاضرین نے بشمول مولانا محمد منظور صاحب، منظور کیا اور اللہ تعالیٰ کو گواہ کرکے اقرار کیا کہ وہ اس دستور کے مطابق نظام جماعت کے پابند رہیں گے۔ اس ترمیم شدہ دستور میں بھی یہ فقرہ جوں کا توں باقی رہا اور آج اس اجتماع کے بہت سے شرکاء زندہ موجود ہیں، وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ مولانا نے اس فقرہ پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا تھا۔

اس کے بعد وہ منظور شدہ دستور باقاعدہ شائع کیا گیا اور مولانا کے پاس

بھی وہ ایک رکن جماعت کی حیثیت سے پہنچا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مولانا کی طرف سے میرے پاس کوئی احتجاج اس بات پر نہیں آیا کہ یہ فقرہ دستور میں کیسے شامل ہو گیا ہے۔

اسی طرح اس دستور کی دفعہ ۹ میں لکھا تھا کہ "اداۓ شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکن جماعت کو اپنی زندگی میں لازماً کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں" پھر ان تغیرات میں ضمن ۵۔ و اور ز میں واضح طور پر غیر الٰہی نظام حکومت کے مناصب، خطابات اور مجالس قانون سازی کی رکنیت کو ترک کر دینے کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ تصریح کی گئی تھی کہ جس شخص کی زندگی میں یہ تغیرات نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت سے خارج کیا جائیگا۔

یہ دفعہ مسودے میں بھی موجود تھی، پہلے اجتماع میں مولانا محمد منظور صاحب کے سامنے پڑھی بھی گئی، بالاتفاق منظور بھی ہوئی، اور اجتماع کے بعد جماعت کے باقاعدہ دستور کی حیثیت سے شائع بھی ہوئی۔ اس تمام کارروائی میں مولانا محمد منظور صاحب شریک رہے اور کبھی ایک لفظ اس کے خلاف نہ کہا۔ بلکہ تمام ارکان جماعت اُس وقت یہی سمجھتے تھے کہ مولانا کا عقیدہ و مسلک یہی ہے اور جماعت سے اُن کی علیحدگی کے بعد بھی ارکان جماعت کا بالعموم یہی خیال تھا کہ ان کی بے اطمینانی کے وجوہ دوسرے ہیں، عقیدہ و مسلک اور نصب العین کی حد تک وہ ہمارے ساتھ ہیں"

یہ بیان مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی کا ہے جو شروع سے جماعت کے سارے حالات سے براہِ راست واقف ہیں۔ میں اس پر صرف اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ جماعت کے دوسرے اجتماع میں راقم سطور بھی شریک تھا۔ اُس موقع پر مولانا نے میرے اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے سامنے دستور کے بعض الفاظ اور فقروں پر مولانا تھانوی مرحوم یا ان کے حلقے کے لوگوں کے تاثرات پیش کیے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُن کا تعلق دستور کے بعض الفاظ

اور فقروں ہی سے تھا کسی اصولی چیز سے ہرگز نہیں تھا۔ مولانا نے جماعت سے علٰحدگی کے بعد مجھ سے میرے وطن میں ملاقات کی تھی اور اپنی علٰحدگی کے متعلق سارے حالات تفصیل کے ساتھ مجھے سنائے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع پر بھی مولانا نے اس اصولی اختلاف کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے بعد بھی مولانا سے میری ملاقاتیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں اور ہم جماعت کے مسائل پر گفتگوئیں بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی نہیں محسوس کیا کہ مولانا جماعت سے کوئی اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کے اختلاف کو محض ایک جذباتی اختلاف سمجھا۔

اب تھوڑی دیر کے لیے اس بحث کو نظر انداز کیجیے کہ مولانا پہلے ہی سے مذکورۂ بالا اصول کے مخالف تھے یا اب اس کے مخالف ہوگئے ہیں۔ آئیے اس امر کا تعین کریں کہ مولانا مخالف کس چیز کے ہیں؟ عقیدۂ توحید کی تشریح کے اُس حصہ کے جو پانچویں فقرہ میں بیان ہوتی ہے، یا دفعہ ۴ کے ان مطلوبہ تغیرات کے جو ضمن "ہ۔ و اور ز" میں بیان ہوئے ہیں؟ اس کا تعین ہمیں خود مولانا کے بیان کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

مولانا اپنے مضمون مندرجۂ الفرقان میں فرماتے ہیں:۔

> "مولانا مودودی سے خود اس عاجز نے اس مسئلہ کے بارہ میں گفتگو کی تھی اور اس وقت یہ طے ہوگیا تھا کہ غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنا اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لیے ضروری تو قرار دیا جائے گا لیکن اس کو شرعی مسئلہ کی حیثیت نہیں دی جائے گی۔"

مولانا کے اس بیان سے ایک بات تو یہ معین ہوئی کہ مولانا کو عقیدۂ توحید کی اُس تشریح سے کوئی اختلاف نہیں ہے جو پانچویں فقرہ میں بیان ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ معین ہوگئی کہ مولانا کو اس امر سے بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ "غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنا اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ سے اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لیے ضروری قرار دیا جائے"۔ تیسری بات یہ معین ہوگئی کہ مولانا کو اختلاف اس بات سے ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنے

کو ایک شرعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

گویا خلاصۂ بحث یہ نکلا کہ جماعت نے جو عقیدہ بیان کیا وہ درست۔ اس عقیدہ کے مقتضا کے مطابق اپنے ارکان سے، پیشِ نظر حالات میں اس نے جن تغیرات کا مطالبہ کیا وہ بھی درست۔ البتہ اُس سے یہ جُرم صادر ہو گیا کہ اس نے ان مطالبات کو شریعت اور دین کے مطالبات کی حیثیت سے پیش کیا، یہ کہہ کر نہیں پیش کیا کہ یہ ہمارے اپنے ذاتی مطالبات ہیں، ان کو دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

مَیں مولانا سے بادب پوچھتا ہوں کہ اگر یہ مطالبات دین کے مطالبات نہیں ہیں تو آخر ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اپنے ارکان سے ان کی تعمیل کا مطالبہ کریں؟ جماعت اسلامی عام اصطلاح میں کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہے کہ محض اپنی صوابدید پر جس چیز کو چاہے ضروری قرار دے اور جس چیز کو چاہے غیر ضروری قرار دے۔ وہ تو ہر معاملہ میں اسلام کے اصولوں اور ان کے محویٰ اور مقتضا کو سامنے رکھ ہی کے فیصلہ کرتی ہے۔ اگر اس کے بغیر وہ کوئی قدم اٹھائے تو اس کے ارکان اس سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے یہ قدم اسلام کے کس اصول کی روشنی میں اٹھایا ہے؟

ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی بے تکلف پورے شرح صدر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ کسی غیر الٰہی نظام کے ساتھ تعاون حرام ہے۔ مسلمانوں کو قرآن مجید میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ ہدایت کی گئی ہے کہ صرف اُس نظام کے ساتھ تعاون کرو جو خدا کی وفاداری اور حدود اللہ کی پاسداری پر قائم کیا گیا ہو، اُس نظام کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کرو جو حق تلفی اور تعدّی پر قائم کیا گیا ہو۔ تعاونوا علی البر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ اس تصریح کے بعد جس میں کوئی استثنا نہیں ہے، مسلمان کے لیے یہ بات کیسے جائز ہو سکتی ہے کہ وہ کسی غیر الٰہی نظام کے ساتھ تعاون کرے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نظام غیر الٰہی ہو اور وہ بر و تقویٰ کا نظام بن سکے؟ یا کوئی نظام غیر الٰہی ہو اور وہ اثم و عدوان سے پاک ہو سکے؟ اگر یہ دونوں باتیں محال ہیں تو یہ بھی محال ہے کہ کوئی مسلمان خدا کے اس حکم کی خلاف ورزی کیے بغیر کسی غیر الٰہی نظام سے تعاون کا رشتہ قائم

کرسکے کسی نظام کے ساتھ تعاون کے معنی ہیں اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں اور اپنی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو اس کے برپا کرنے اور پروان چڑھانے میں صرف کرنا۔ کیا مولانا یہ فرما سکتے ہیں کہ ایک مسلمان کی قوتیں اور قابلیتیں اسی لیے ہوتی ہیں کہ وہ ایک نظامِ باطل کو پروان چڑھانے میں صرف ہوں؟ اور کیا مولانا یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی صحیح الدماغ مفتی نے آج تک اس بات کے جواز کا فتویٰ دیا ہے یا دے سکتا ہے؟

مولانا معاف فرمائیں وہ جائز کسی چیز کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور دلیل کسی اور چیز کی دے رہے ہیں۔ وہ دعویٰ تو کر رہے ہیں نظامِ باطل کے ساتھ بعض حالات میں تعاون کے جائز ہونے کا اور دلیل دے رہے ہیں دو ناگزیر برائیوں میں سے ہلکی برائی کے اختیار کے جواز کی۔ یہ چیز تو ایسی ہے جس سے نہ ہمیں اختلاف ہے اور نہ کسی شخص کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر صورتِ حال یہ ہو کہ ہمارے لیے صرف دو برائیاں ہی برائیاں ہوں جن میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑ جائے، کوئی تیسری راہ نیکی اور خیر کی سرے سے موجود ہی نہ ہو تو بلا شبہ ہمیں ان دونوں میں سے اُس برائی کو ترجیح دینی پڑے گی جو ہمارے اپنے مفاد دینی و ملی کے نقطۂ نظر سے ہلکی ہو، اور اس وقت ہمارا ایسا کرنا ہی ہمارے دین کا تقاضا ہو گا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے ایک ایسی راہ بھی کھلی ہو جس پر چل کر ہم اپنے نصب العین کی طرف براہ راست مارچ کر سکتے ہوں، تو پھر ہمارے لیے اُس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا ناجائز ہے۔ میں اس بات کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ غیر منقسم ہندوستان میں جبکہ ہم نے اپنا دستور بنایا تھا اس وقت ہم نے انگریزی نظام کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کو حرام قرار دیا تھا، اس لیے کہ ملک کے سیاسی نظام کے اندر ہمارے لیے اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ ہم براہ راست اپنے نصب العین کے مطابق ملک کے نظام کو تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد کر سکتے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم انگریزوں کی گاڑی وغیرہ کھینچنے پر قانع رہتے، یا ملک میں اس نوع کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرتے جس نوع کی تبدیلی دوسری سیاسی جماعتیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ اسی زمانہ میں نازیوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہوتا

اور اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہوتا کہ ہندوستان پر جاپان یا جرمنی کا قبضہ ہو جائے گا اور ان کی حکومتیں ہمارے لیے نظامِ حق کے قیام کی جد و جہد کے اتنے مواقع بھی باقی نہ رہنے دیں گی جو انگریزی حکومت میں موجود ہیں تو ہم انگریزوں کے نظام کو جرمنوں یا جاپانیوں کے حملہ سے بچانے کی ضرور کوشش کرتے۔ اس لیے نہیں کہ ایسی صورت میں ہمارے لیے باطل سے تعاون جائز ہو گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ جب دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے اور خیر کی راہ مسدود ہو جائے تو شریعت اور عقل کا فتویٰ یہی ہے کہ ایسی شکل میں اس برائی کو اختیار کیا جائے جو ہمارے اپنے نصب العین کے پہلو سے ہلکی ہو۔

مولانا غور فرمائیں کہ کہاں یہ اختیار اہون البلیتین کا اصول اور کہاں نظامِ باطل کے ساتھ تعاون کا معاملہ؟ دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اول تو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اہون البلیتین کا اختیار کرنا صرف اس شکل میں جائز ہے جب کہ کوئی اور راہ خیر دو برائیوں کے سوا باقی ہی نہ رہ گئی ہو۔ نہ کہ اس وقت بھی کسی برائی ہی کو اختیار کر لیا جائے جبکہ ایک خیر کی راہ کھلی ہوئی ہو یا کھل سکتی ہو۔ دوسرے اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس شکل میں بھی اہون برائی کو صرف اختیار کر لینے کی اجازت ہے نہ کہ اس کو اپنی قوتوں اور قابلیتوں سے پروان چڑھانے کی جس کو تعاون کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے بھی ایک نظامِ باطل کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

اس سوال پر جماعت اسلامی کے لٹریچر میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب کسی مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے[۱]۔ لیکن معلوم نہیں کیوں لوگوں کو یہ ثابت کرنے پر اصرار ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنی قوتیں اور قابلیتیں نعوذ باللہ ایک طاغوتی نظام کو پروان چڑھانے میں صرف کیں۔ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے اللہ تعالیٰ ان کو معاف

---

[۱] ملاحظہ ہو تفہیمات حصہ دوم۔ مضمون "حضرت یوسف اور غیر اسلامی حکومت کی رکنیت"

کرے۔ انہوں نے ایک عظیم الشان پیغمبر پر بڑی سخت تہمت لگائی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات جو ہمیں قرآن مجید اور توریت سے معلوم ہوئے ہیں اُن سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح ایک نظام باطل کو نظام حق میں تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی جس طرح تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے فرمائی۔ بس فرق یہ ہے کہ بادشاہِ وقت کی غیر معمولی عقیدت کی وجہ سے ان کو اُس کشمکش سے دوچار نہیں ہونا پڑا جس کشمکش سے دوسرے انبیائے کرام کو دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود کبھی بادشاہ مصر سے اس کی حکومت کے اندر کسی ملازمت یا کسی عہدہ کے لیے درخواست نہیں کی، بلکہ بادشاہ خود ان کے جیل کے حالات سُن کر اُن کا معتقد ہُوا اور پھر اُن سے ملاقات کر کے اور اپنے خواب کی حیرت انگیز تعبیر معلوم کر کے ان کا اس قدر گرویدہ ہُوا کہ ان کو اپنا پیر و مرشد بنا لیا اور ان پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کر کے یہ اشارۃً عرض کیا کہ وہ حکومت کی ذمہ داری قبول فرمائیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ ایک شخصی حکومت میں تمام امر و نہی کا مالک بادشاہ ہی ہوتا ہے، اور وہ کسی کا معتقد اور گرویدہ ہو جائے تو عملاً تمام سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں آجاتی ہے، یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بادشاہ کی درخواست منظور فرمالیں اور اس طرح اس ملک کے نظام کو ایک نظامِ حق میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ بادشاہ کو اُس وقت سب سے بڑی فکر اس پیش آنے والے قحط کی دامنگیر تھی جس کو اس نے خواب میں دیکھا تھا اور جس کی اس کو حضرت یوسفؑ نے اس کے خواب کی تعبیر کی شکل میں خبر دی تھی۔ حضرت یوسفؑ نے اسی خطرہ سے ملک کو نجات دلانے کا ارادہ کیا کہ یہ سب سے بڑی انسانی خدمت بھی تھی اور لوگوں کو اپنے فکر و عمل سے متاثر کرنے کی نہایت اچھی راہ بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ اگر آپ کی حکومت کو میری امداد کی ضرورت ہے تو مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں ملک کو قحط سے بچانے کے لیے ملک کے تمام ذرائع کو کنٹرول کر سکوں۔ بادشاہ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور اپنی تمام مملکت میں یہ اعلان کر

دیا کہ وہ حضرت یوسفؑ کے تمام احکام کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے۔ چنانچہ اس طرح مملکت کی ساری باگ حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں آگئی۔ بادشاہ ان کو اپنا باپ کہتا تھا اور ان کے تمام احکام کی بے چون وچرا تعمیل کی جاتی تھی۔

اس واقعہ کو جو لوگ کفار کی کاسہ لیسی اور طاغوتی نظاموں کی غلامانہ چاکری کے جواز کی دلیل ٹھہراتے رہے ہیں اور اب تک بار بار کی تفہیم کے باوجود اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتے ان پر افسوس اور صد ہزار افسوس۔ اگر کسی خوش بخت کو حضرت یوسف کی طرح کسی نظام باطل پر حاوی ہو کر اس کو نظام حق میں تبدیل کرنے کی سعی کا موقع مل جائے تو وہ ضرور اس سے فائدہ اٹھائے اور انقلابی طریقے اختیار کرنے کے بجائے اسی طریق سے نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ کیا بوالفضولی ہے کہ گداگروں کی طرح در در نوکریوں کی بھیک مانگی جائے اور دعویٰ یہ کیا جائے کہ یہ اسوۂ یوسفی کی پیروی ہے!

جماعت اسلامی کے اس فتوے کے دو بڑے نقصانات مولانا نے بتائے ہیں:۔

ایک یہ کہ اس فتوے کے سبب سے جماعت کے بہت سے ارکان کے نزدیک اُن علمائے دین کا ایمان ہی مشتبہ ہوجاتا ہے جنہوں نے غیر اسلامی حکومتوں کی نوکریوں کو جائز ٹھہرایا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس کے سبب سے خواہ مخواہ کو بہت سے ارکان جماعت گنہگار ہو رہے ہیں کیونکہ وہ اس فتوے کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے بھی سرکاری نوکریاں کر رہے ہیں اور وہ اپنے آپ کو مضطر قرار دیے ہوئے ہیں حالانکہ وہ مضطر کی تعریف میں نہیں آتے۔

مولانا نے اپنے دعوے کے پہلے حصّہ کے ثبوت میں دو واقعے پیش کیے ہیں۔ ایک واقعہ "جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ایک دوست" کے حوالہ سے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم کے متعلق ہے۔ اس واقعہ کو پیش کرنے کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا مرحوم کے مریدوں کو جماعت کے خلاف بھڑکایا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ جماعت کے اندر ایسے افراد موجود ہوں جو مولانا اشرف علی صاحب مرحوم کے متعلق بہت اچھی رائے نہ رکھتے ہوں یہ

بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی موقع پر اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر گزرے ہوں۔ اس طرح کے افراد ہر جماعت میں ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اور میں باور نہیں کر سکتا کہ خود مولانا کے گروہ میں دوسری جماعتوں کے بزرگوں کے متعلق اسی طرح کی رائیں رکھنے والے لوگ موجود نہ ہونگے۔ لیکن اس طرح کے انفرادی رجحانات کو کبھی پوری جماعت کے سر نہیں تھوپا جاتا۔ ہمارے نزدیک کسی جماعت کے اندر اس طرح کے لوگوں کا پایا جانا ذرا بھی عجیب نہیں ہے۔ البتہ یہ کیرکٹر کچھ بہت ہی عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جماعت اسلامی سے اپنے آپ کو تعلق رکھنے والا بھی ظاہر کرے اور پھر وہ جماعت کے ارکان کے شخصی تاثرات کو جا جا کر مولانا محمد منظور صاحب سے بیان بھی کیا کرے۔ اور پھر کمال ہے مولانا کا کہ اس کی جاسوسی کی سوغاتیں قبول کر کر کے رکھتے جائیں اور جب جماعت کے خلاف کوئی مضمون لکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی سازگار موسم پیدا کر دے تو ان جمع شدہ معلومات کو "جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ایک دوست" کے حوالہ سے مضمون میں درج فرما دیں۔ کیا مولانا پسند فرمائیں گے کہ ان کی تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دوسرے بھی اسی طرح استعمال کرنا شروع کر دیں؟

مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے ان "دوست" کو یہ نصیحت کرتے کہ بھائی، یا تو تم جماعت اسلامی کے ساتھ تعلق نہ قائم کرو، اور اگر تعلق رکھتے ہو تو جماعت کے افراد وقتاً فوقتاً دوسروں کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات جو بیان کیا کریں ان کو نقل نہ کرتے پھرو، یہ بات مجلسی آداب و روایات کے خلاف ہے اور اس سے مسلمانوں کے درمیان آپس کی بدگمانیاں پیدا ہوتی اور پھیلتی ہیں۔ میں مولانا کو اس امر سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں دوسرے حلقوں سے متعلق ہمارے علم میں بھی آتی رہتی ہیں لیکن ہم ان کا نوٹس بھی نہیں لیتے۔ چہ جائیکہ ان کو اتنی اہمیت دیں کہ ان کو دلیل بنا کر ایک پوری جماعت کو مطعون کر ڈالیں۔

دوسرا واقعہ مولانا نے کسی پروفیسر صاحب یا ماسٹر صاحب کا نقل فرمایا ہے کہ وہ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ کسی غیر اسلامی ریاست میں مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ کی کنیت

شرک ہے اور ویسا ہی شرک ہے جیسے بت پرستی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ایک رکن کا، جو ایک مشہور خادم ملت ہیں، نام لیا اور اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ واقعتہً ایسا سمجھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کی وجہ سے وہ اسلام سے بالکل خارج ہو چکے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا بے شک۔

اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر صاحب یا ماسٹر صاحب نے مولانا کو نہایت غلط جواب دیا۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ بیچارے اِن مولویانہ معارضات سے نمٹنا نہ جانتے تھے، اس وجہ سے غصہ میں آکے ایک ایسی بات کہہ گئے جو صحیح نہ تھی۔ لیکن میں مولانا سے یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خود اُن کا معارضہ پروفیسر صاحب کے جواب سے بھی زیادہ غلط ہے۔ یہ طریقہ نہایت عامیانہ ہے کہ ایک چیز کے صحیح ہونے کی دلیل کتاب وسنت کے بجائے زید و بکر کے عمل سے لائی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمانوں کا نہایت ہمدرد و ہوا خواہ ہو، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا ہر فعل شریعت کے مطابق ہو۔ سرسید، حالی، چراغ علی، محسن الملک، مصطفیٰ کمال، امان اللہ خاں، محمد علی جناح، سب مسلمانوں کے نہایت ہمدرد و ہوا خواہ تھے۔ لیکن کیا مولانا اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ان کو مستقل دینی سند مان لیں اور جو جو کچھ وہ کر گذرے ہیں اُس سب کو محض اس دلیل کی بنا پر جائز قرار دے دیں کہ "مسلمانوں کا دردو فکر ان کے دل میں کسی دوسرے مدعی سے کم نہیں ہے"۔ یہ طرزِ استدلال قومیت پرست حلقوں میں تو بہت مقبول رہا ہے لیکن مولانا کے اس بیان سے یہ کھلا کہ یہی منطق ہمارے دیندار حلقوں میں بھی چل رہی ہے۔ سبحان اللہ!

مولانا نے دوسرا نقصان اس فتوے کا یہ بتایا ہے کہ اس کے سبب سے بہت سے مسلمان اور جماعت کے بہت سے ارکان گنہگار ہو رہے ہیں اس لیے کہ وہ سرکاری نوکریوں کو حرام تسلیم کرتے ہوئے محض اضطرار کے بہانے اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ شریعت کے معاملہ میں بہانہ سازی نہایت مکروہ فعل ہے۔ جو لوگ دین

کے تقاضوں کو پورا نہیں کرنا چاہتے ان کو کسی نے مجبور نہیں کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ کو دینداری کا مظاہرہ کریں۔ اِس زمانہ میں اگر کوئی شخص ایک نظامِ باطل کی نوکری کرے تو اہل دنیا بھی اس کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور اہلِ دین بھی اس کے اس فعل کو سنتِ یوسفی قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ ایک شخص ایسے نفع کے کاروبار کو چھوڑ کر جماعتِ اسلامی کے چکر میں پھنسے! لیکن اگر کوئی شخص ہمارے دلائل سے مطمئن ہو کر اس راستہ پر آتا ہے تو اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ چالبازی نہ کرے۔

یہ ہمارا مشورہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی مشورہ مولانا کو بھی ان دوستوں کو دینا چاہیے جو جماعت کے اس مسلک کو تو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کو صحیح سمجھتے ہوئے ہی جماعت میں داخل ہوئے ہیں، لیکن اس مسلک پر عمل کرنے میں دیانتدار نہیں ہیں۔ لیکن مولانا ان کو مشورہ دینے کے بجائے خود ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ چونکہ جماعت کے بعض ارکان جماعت کے اس مسلک پر دیانتداری کے ساتھ عمل نہیں کر رہے ہیں اور اس کے سبب سے گنہگار ہو رہے ہیں اس لیے صائب رائے یہی ہے کہ تم اپنا مسلک ہی بدل ڈالو۔

ایک نیک نیت آدمی کو اس پر کچھ اچنبھا سا ہوگا کہ مولانا نے یہ کیا بات فرما دی! لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سوچنے کا یہ انداز کچھ مولانا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اِدھر زوال کی صدیوں میں ہمارا جو علم فقہ مرتب ہوا ہے وہ زیادہ تر اسی طرح کی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی سوسائٹی جس رفتار سے بگڑتی گئی ہے، اور زندگی کے مختلف گوشوں میں شریعت سے انحراف جس قدر بڑھتا گیا ہے، مسلمانوں کی بگڑی ہوئی زندگی کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کے لیے ہمارے علماء حضرات شریعت کے تقاضوں میں اسی نسبت سے چھانٹی کرتے چلے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شرک و توحید کا فیصلہ بھی اب قرآن و حدیث کے بجائے ہندوستان کی لادین پارلیمنٹ کے بعض ارکان کے طرزِ عمل سے ہونے لگا ہے۔ آخر اکرام مسلم کا ضابطہ کوئی معمولی چیز تھوڑا ہی ہے!

مولانا نے اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک بڑی ہی دلچسپ بات ارشاد فرمائی ہے جو ان کے پچھلے تمام ارشادات پر بازی لے گئی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"میرے نزدیک اس مسئلے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اگر کسی جماعت کے دو چار مسئلے بھی جمہوری مسلمانوں سے الگ ہوں تو کچھ دنوں کے بعد اس کا ایک مذہبی فرقہ بن جانا بالکل یقینی ہے۔ اگر بالفرض جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی عالم کی ذاتی تحقیق یہی ہے تو رہے۔ لیکن رکن جماعت ہونے کے لیے اس مسئلے پر ایمان لانے کو شرط قرار دینا تو صریحاً اپنے متبعینِ اجتہاد کا ایک فرقہ بنانا ہے۔"

جماعت کے مخالفین مدت سے اس فکر میں تھے کہ اس جماعت کو کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر ایک "مذہبی فرقہ" بنا ڈالیں۔ لیکن انہیں اس کے لیے کوئی معقول بنیاد نہیں مل رہی تھی۔ مولانا کی ذہانت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے کم از کم ایک بنیاد تو تلاش کر کے فراہم کر ہی دی! اس کے لیے مولانا ہمارے تمام مخالفین کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مگر مولانا اجازت دیں تو ہم ان سے گذارش کریں گے کہ وہ اس کے ساتھ لگے ہاتھوں چند سوالات پر اور روشنی ڈال دیں:۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے یا چند مسائل میں کتاب و سنت کی دلیل سے ایک حکم شرعی بیان کرنے اور اس کے اتباع پر چند لوگوں کے جمع ہو جانے سے ایک مذہبی فرقہ بن جاتا ہے تو مولانا کے نزدیک اُس "فرقے" کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ وہی تفرّق فی الدین ہے جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے؟ یا یہ ان اختلافات میں سے ہے جن کے جواز کی اس دین میں گنجائش پائی جاتی ہے؟ اگر مولانا کے نزدیک یہ تفرّق فی الدین ہے تو اُن بزرگوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے جنہوں نے دو چار مسئلوں میں نہیں، ہزارہا مسائل میں اپنے اجتہاد سے احکام شرعیہ مرتب کیے اور ان میں سے ہر ایک کے اتباع پر لاکھوں کروڑوں مسلمان جمع ہو کر الگ الگ گروہ بن گئے؟ کیا یہ سب تفرّق فی الدین کے مجرم تھے؟ اور اگر مولانا اس فعل کو جائز اختلافات میں شمار فرماتے

ہیں، تو براہ کرم وہ ارشاد فرمائیں کہ جو چیز اگلوں کے لیے جائز تھی وہ پچھلوں کے لیے کس دلیل سے حرام ہو گئی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ "جمہور مسلمانوں" سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اگر اس سے مراد عوام ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ آج مسلم عوام کی بہت بڑی اکثریت اُن عقائد اور اعمال میں مبتلا ہے جن کو خود مولانا محمد منظور صاحب مشرکانہ عقائد اور مبتدعانہ اعمال کہتے رہے ہیں اور اب تک کہتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں قرآن و حدیث سے استدلال کر کے وہ عقیدے اور عملی طریقے پیش فرماتے ہیں جو ان کے نزدیک اصل شرعی مسلکے ہیں۔ پھر آپ کا ایک مذہبی فرقہ بن جانا کیوں یقینی نہیں ہے؟ اور اگر آپ کی مراد جمہور علماء ہیں، تو براہ کرم مولانا کسی ایک ایسے عالم کا نام لیں جو عقیدۂ توحید کی اُس تشریح کا منکر ہو جو ہم نے اپنے عقیدے کے پانچویں فقرے میں بیان کی ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ ہم نے اپنے دستور میں رکن جماعت ہونے کے لیے ایمان کس چیز پر لانے کو شرط قرار دیا ہے؟ مذکورۂ بالا عقیدے پر، یا اس کے مقتضا کے مطابق عمل کرنے پر؟ ظاہر ہے کہ ہمارا مطالبہ عقیدے پر ایمان لانے کا ہے نہ کہ عمل پر۔ عمل تو اس عقیدے کے منطقی نتائج اور لوازم میں سے ہے، اس لیے ہم نے اسے شرطِ رکنیت ٹھیرایا ہے۔ لیکن مولانا نے یہ کہہ کر صریح مغالطہ دیا ہے کہ ہم لوگوں سے اُس مسئلے پر ایمان لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں جس پر عمل کرنے کو ہم نے شرطِ رکنیت قرار دیا ہے تاکہ اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ جو شخص اس پر عمل نہیں کرتا وہ ہمارے نزدیک کافر ہونا چاہیے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس طرح کے مغالطوں سے خلقِ خدا کو دھوکا دینا اور اپنے جیسے چند خادمانِ دین کو بدگمانیوں کا ہدف بنانا آپ کے لیے کیسے جائز ہو گیا؟ یہ کیسا تقویٰ ہے؟ یہ کیسی فکرِ آخرت ہے؟ یہ کس قسم کا تزکیۂ نفس ہے جس کی مشق آپ پچھلے دس سال میں کرتے رہے ہیں؟

چند زرّیں مشورے

یہاں تک ہم نے جماعت اسلامی سے متعلق مولانا کے تاثرات کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا نے ان تاثرات کے ماتحت ازراہِ کرم جماعت کو چند زریں مشورے بھی دیے ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو مولانا کے خیال کے مطابق وہ خرابیاں دور ہو جا سکتی ہیں جن کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے۔ ہمارے لیے اس مضمون کا سب سے زیادہ اہم حصہ یہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی نسبت بھی اپنے خیالات ظاہر کر دیں۔

(۱) مولانا کا پہلا مشورہ یہ ہے کہ جماعت کے لٹریچر پر نظر ثانی کے لیے ایک کمیٹی بٹھائی جائے جو اُن اعتراضات کو سامنے رکھ کر، جو اب تک سامنے آ چکے ہیں، پورے لٹریچر کا جائزہ لے اور ان چیزوں کو لٹریچر سے خارج کر دے جو لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں۔ اس کمیٹی کی تشکیل کے متعلق مولانا کی رائے یہ ہے کہ اس میں ایک نمائندہ جماعت اسلامی کا ہو اور ایک نمائندہ باہر کا ہو۔

مولانا کی یہ تجویز بظاہر بڑی معصومانہ نظر آتی ہے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مولانا نے اس کو پیش کرنے سے پہلے شاید پانچ منٹ بھی اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہے۔ اور اگر انہوں نے اس تجویز پر غور کر کے اس کو پیش کیا ہے تو ان کے غور و فکر کے متعلق کوئی شخص اچھی رائے نہیں قائم کر سکتا۔

جماعت اسلامی کا لٹریچر بیشتر مولانا مودودی صاحب کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ مودودی صاحب کوئی اکیڈمک طرز کے مصنف نہیں ہیں کہ انہوں نے مجرّد علمی خدمت کے لیے زندگی سے غیر متعلق مسائل پر خامہ فرسائی کی ہو۔ وہ کوئی ناقل قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ایک خاص مسلک کی عربی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو اپنے الفاظ میں اردو میں منتقل کر دیتے ہوں۔ وہ کوئی جامد اور مقلد قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ان کا سارا تصنیفی کارنامہ صرف مکھی پر مکھی مار دینا ہو۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کے وہم میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ ان کا سارا زورِ قلم غسل و وضو کے مسائل تک محدود ہو۔ وہ ایک داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں دعوت و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کے لکھتے ہیں۔

اس مقصد کی خاطر انہوں نے دین کی متعدد ایسی حقیقتوں کو برملا آشکارا کیا ہے جو اگرچہ دین کی نہایت ثابت اور معروف حقیقتیں رہی ہیں لیکن اس دورِ زوال میں ان کو اس وضاحت کے ساتھ کہنے کی ہمت لوگ کھو بیٹھے تھے۔ اس اصلاح کے مقصد کی خاطر ان کو صرف مسلمانوں کے گمراہ فرقوں ہی پر نہیں بلکہ ان فقہی گروہوں پر بھی تنقیدیں کرنی پڑی ہیں جو صحیح بنیاد پر ہونے کے باوجود بہت سی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں ان لوگوں سے بھی لڑنا پڑا ہے جو بیجا تعصبات اور تقلیدِ جامد کی بندشوں میں گرفتار ہیں۔ انہیں دین کے صحیح تصور اور اس کے نظام کے احیاء کی خاطر ان لوگوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی ہے جو موجودہ معاشرے کی قیادت کر رہے ہیں۔ الغرض انہوں نے جب سے قرطاس و قلم کا مشغلہ اختیار کیا ہے ان کو اپنے گردوپیش سے ایک چومکھیا لڑائی لڑنی پڑی ہے۔ حنفی اور اہلِ حدیث، دیوبندی اور بریلوی، صوفی اور مُلّا، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور قادیانی، منکرِ حدیث اور منکرِ شریعت، نیشنلسٹ اور کمیونسٹ، کانگرسی اور مسلم لیگی، غرض کوئی ایسا نہیں ہے جس پر ان کو تنقید نہ کرنی پڑی ہو اور وہ اُن کے لٹریچر کے کسی نہ کسی حصہ سے بیزار نہ ہو۔ پھر یہی نہیں کہ انہوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے بلکہ اپنے خیال کے مطابق ایک مثبت پروگرام بھی پیش کیا ہے جس پر چل کر، ان کے خیال میں مسلمانوں کی حالت درست کی جا سکتی ہے اور اسلام کو از سرِ نو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے برپا کیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسے مصنف کی کتابوں پر نظرِ ثانی کے لیے اگر اُس طرح کی کمیٹی بٹھائی جائے جس طرح کی کمیٹی مولانا نے تجویز فرمائی ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ دیوبندی حضرات کا (بشرطیکہ کمیٹی کا دوسرا نمائندہ دیوبندی ہو) غصہ جماعت کے خلاف کچھ کم ہو جائے گا۔ باقی رہیں دوسری تمام جماعتیں جو مودودی صاحب کی تنقیدات کے زخم خوردہ ہیں وہ تو بدستور نالاں ہی رہیں گی۔ اور اگر ان تمام گروہوں کو خوش کرنے کے لیے ہر جماعت کا ایک ایک نمائندہ لیا جائے تو میں مولانا کو یقین دلاتا ہوں کہ مودودی صاحب کے موجودہ لٹریچر کا کوئی حصہ نہ صرف یہ کہ بچ نہیں رہے گا بلکہ ان بیچارے کو کچھ گھر سے بھی دے کے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

مولانا نے اس سلسلہ میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم کا ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے اس علم و تبحر کے باوجود ایک عالم کو اپنے پاس سے ایک بڑی تنخواہ دے کر اپنی کتابوں پر نظرثانی کرائی اور اس نظرثانی کے نتیجہ کے طور پر اپنی بہت سی رایوں سے رجوع کر لیا اور بہت سی عبارتوں بدل ڈالیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا تھانوی مرحوم نے یہ کام بہت اچھا کیا۔ ہم بھی مولانا مودودی صاحب کو یہ مشورہ دیں گے کہ اگر انہیں بھی کوئی ایسا شخص میسر آ جائے جو ان کی کتابوں پر نظرثانی کر سکے تو ایک بڑی تنخواہ دے کر یہی وہ بھی اپنی کتابوں پر نظرثانی کرا ڈالیں۔ لیکن میں مولانا منظور صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قسم کی نظرثانی ایک معترض کو بھی مطمئن نہ کر سکیگی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا تھانویؒ نے جو نظرثانی اپنی کتابوں پر کرائی اس کے باوجود اُن کے مکفّرین نے اپنا فتوائے کفر واپس نہیں لیا۔ اُن کو مطمئن کرنے کی شکل تو صرف یہ تھی کہ ترجیح الراجح کی تیاری میں مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم کو بھی برابر کا حصہ ملتا۔ لیکن کیا مولانا بتا سکتے ہیں کہ جس طرح مولانا جماعت اسلامی کے لٹریچر پر نظرثانی کرنے والی کمیٹی میں پچاس فیصدی نمائندگی اس کے مخالفین کو دلوا رہے ہیں اُسی طرح مولانا تھانوی مرحوم نے بھی کوئی کمیٹی بنائی تھی جس میں پچاس فیصدی نمائندگی بریلوی حضرات کو دی ہو؟

پھر اگر یہ نسخہ اتنا ہی سستا تھا تو مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان وغیرہ پر کیوں نہ نظرثانی کرائی گئی؟ اور جب دیوبند کے خلاف امکانِ کذب باری وغیرہ پر کفر کے فتوے نکلے تھے تو کیوں نہ اکابر دیوبند کی کتابیں ایک کمیٹی کے حوالہ کی گئیں جس میں بریلی کو بھی پچاس فیصدی نمائندگی دی گئی ہوتی؟

یہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ مولانا کی نادر تجویز پر تبصرہ تھا۔ باقی رہا اصل مسئلہ تو میں مولانا کو یقین دلاتا ہوں کہ مودودی صاحب پر اگر ان کی کوئی غلطی دلائل سے واضح کر دی جاتی ہے تو اس کے تسلیم کر لینے میں اُن کو ذرا بھی تامل نہیں ہوتا ہے۔ خود مولانا محمد منظور صاحب کو

بھی تجربہ ہوگا کہ اب سے دس سال پہلے انہوں نے "حقوق الزوجین" کی ایک عبارت کی طرف مولانا مودودی کو توجہ دلائی اور انہوں نے "ترجمان القرآن" میں اعلان کر کے اس عبارت سے رجوع کیا۔ ابھی حال کی بات ہے کہ اپنی کتاب "سود" کی ایک پوری فصل انہوں نے اپنی ایک غلطی پر متنبہ ہو کر بدل ڈالی اور اس کا اعلان کر دیا۔

ایک ذہین اور نیک نیت آدمی کی نظر میں اپنی رائے کی کتنی ہی اہمیت ہو لیکن جب وہ اپنی کسی غلطی پر متنبہ ہو جاتا ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا مودودی کو بھی اگر ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے تو جیسا کہ انہوں نے خود اعلان کیا ہے وہ اپنی کسی غلطی پہ اصرار نہیں کریں گے۔ لیکن یہ بات تو کچھ بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ دو مولوی مل کر ان کی کتابوں کی پڑتال کریں اور یہ بتائیں کہ انہوں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے اور کہاں کہاں صحیح لکھا ہے! اگر اس قابلیت کے دو مولوی صاحبان ہمارے ملک میں موجود ہیں تو وہ مودودی کی کتابوں پر نظرِثانی کی کھکھیڑ اپنے سر کیوں لیں؟ وہ خود ہی لوگوں کو کتابیں لکھ کر کیوں نہ بتائیں کہ صحیح دین یہ ہے جو وہ بتاتے ہیں نہ کہ وہ جو مودودی صاحب بتا رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دیگا۔ وہ میدان میں نکلیں تو سہی۔ یہ علم و فضل رکھتے ہوئے آخر وہ چھپے کیوں بیٹھے ہیں جبکہ خلق خدا گمراہ ہوئی جارہی ہے!

(۲) مولانا کا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ سلف صالحین کے ساتھ مسلمانوں کو جو تعلق و وابستگی اور ان کے علم و دین پر جس درجہ کا اعتماد اس زمانہ کے مسلمانوں کو ہونا چاہیے جماعت میں اس کو پیدا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے۔

مولانا نے یہ بات فرمائی تو مشورہ کے رنگ میں ہے لیکن ہے یہ درحقیقت جماعت پر ایک بڑی تہمت۔ مولانا کے اس ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ جماعت اپنے لٹریچر کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں سے سلف صالحین کے احترام کی جڑیں اکھاڑ رہی ہے، اس فتنہ کا سدباب ہونا چاہیے اور اس کی جگہ پر اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کو سلف صالحین سے عقیدت پیدا ہو۔

مولانا کے اس مشورہ کا تو ہم احترام کرتے ہیں لیکن اس میں جو غلیظ قسم کی تہمت چھپی ہوئی ہے اس کو ہم اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کی تمام بے بنیاد اور جھوٹی تہمتیں درحقیقت مستحق ہیں مسلمانوں کے دلوں میں سلف صالحین کا جو احترام از روئے کتاب وسنت ہونا چاہیے وہ تو ہمارے دل میں ہے اور اسے ہم پیدا بھی کرنا چاہتے ہیں، لیکن جو احترام از روئے کتاب وسنت خدا اور اس کے رسولوں کے سوا کسی اور کا نہ ہونا چاہیے اس سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس سے بچانا چاہتے ہیں۔ مولانا براہ کرم پہلے یہ بتائیں کہ سلف صالحین سے تعلق ووابستگی اور ان کے علم ودین پر اعتماد کے صحیح اسلامی حدود کیا ہیں؟ پھر ہم ان سے پوچھیں گے کہ ہم نے ان حدود سے کب اور کہاں تجاوز کیا ہے؟

سلف صالحین کا احترام پیدا کرنے کے لیے یہ نہایت ہی احمقانہ طریقہ ہے کہ بلید الذہن لوگ ان کی طرف ایسی لایعنی باتیں منسوب کریں جن کا کوئی عاقل تصور بھی نہ کرسکتا ہو اور پھر اصرار کیا جائے کہ ان باتوں کو سلف صالحین کی خاطر مان لیا جائے۔ حال ہی میں ایک پیرزادہ صاحب نے مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کا نام لے کر تصور شیخ کی ایک نہایت گھناؤنی توجیہ پیش فرمائی جو سراسر ضلالت تھی۔ کیا حضرت مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی عزت وعظمت اسی طرح کی باتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے گی؟ پھر میں نے پیرزادہ صاحب کے پیش کردہ تصور شیخ کے چہرہ سے نقاب اٹھایا تو مولانا منظور صاحب اُلٹے میرے ہی سر ہو گئے کہ تو نے تو مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کو مشرک وکافر بنا ڈالا! میں مولانا سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا انہی باتوں کو آپ اپنے اسلاف کی طرف منسوب کرکے ان کے ناموں کو روشن کرنا چاہتے ہیں؟ اگر مولانا منظور صاحب کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہم بھی انہی طریقوں سے مسلمانوں کے دلوں میں اسلاف کا احترام پیدا کریں جس طرف انہوں نے رہنمائی کی ہے تو میں صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ ہم اس سے معذور ہیں۔ ان طریقوں سے اسلاف کی عزت وعظمت تو معلوم نہیں دلوں میں پیدا ہوگی یا نہیں البتہ دین کی جڑیں اکھاڑنے کی جو کوشش یہ ہمارے مفتیان دین کر رہے ہیں اس میں کوئی کسر نہیں رہ جائے گی۔ آخر اس سے بڑھ کر

اس دین کے لیے نقصان دہ چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن اور حدیث اور صریح عقل کے خلاف باتیں بزرگوں کی طرف نسبت کر کے پیش کی جائیں اور پھر بزرگوں کے نام کا واسطہ دیکر لوگوں سے ان کے ماننے کا مطالبہ کیا جائے۔

(۳) مولانا کا تیسرا مشورہ یہ ہے کہ جماعت کے حلقے سے باہر علم و دین کی حامل جو شخصیتیں واجب الاحترام اور قابلِ استفادہ ہوں ان کے احترام اور ان کے محاسن کی قدر و عظمت کی مشق کی جائے اور شکاری کمیونسٹوں کی طرح صرف اپنے نظریات کی تبلیغ ہی کے ارادہ سے نہیں بلکہ دین و ایمان کے رشتہ سے ..... اور استفادہ کی نیت سے ان کی خدمت میں حاضری دی جائے۔

میں مولانا کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک علم اور دین کی حامل شخصیتوں کے احترام اور ان سے استفادہ کی خواہش کا تعلق ہے ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور بغیر کسی "مشق" کے یہ چیز ہمارے اندر موجود ہے۔ اہل علم اور اہل اخلاص سے محبت تکلف نہیں پیدا کی جاتی اور نہ اس کے لیے کسی ریاضت اور ورزش کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ معقول آدمیوں میں یہ چیز خود بخود ہوتی ہے۔ ہم جن لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید پاتے ہیں ان سے سبقت کر کے خود ملتے ہیں اور جب ملتے ہیں تو کھلے دل سے ملتے ہیں اور استفادہ و افادہ دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی نے آپ کے شیخ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی خدمت میں سفر کر کے دو مرتبہ حاضری دی۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جماعت کے ذمہ داروں میں جماعت سے باہر کے لوگوں کا احترام اور ان کی قدر کا جذبہ نہیں ہے؟ اور کیا آپ ایمان داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کمیونسٹوں کی طرح اپنے کچھ من گھڑت نظریات لے کر مولانا الیاس صاحب مرحوم کو شکار کرنے گئے تھے؟ میں نے بھی ایک مرتبہ مولانا الیاس صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضری دی ہے اور مجھے یاد آتا ہے کہ اُس موقع پر مولانا منظور صاحب بھی موجود تھے۔ کیا مولانا فرما سکتے ہیں کہ میں نے کوئی کوشش کمیونسٹوں کی طرح اُن کو شکار کرنے کی کی؟ تقسیم سے پہلے مجھے جب کبھی یو۔پی جانے کا اتفاق ہوا میں نے بریلی میں اُتر کر مولانا سے ملنے کی ضرور کوشش کی۔ کیا مولانا کہہ سکتے

ہیں کہ اخلاص اور محبت کے سوا کوئی اور چیز میرے اُترنے کا باعث ہوئی اور کیا مَیں نے کمیونسٹوں کی طرح اُن کو پھانسنے اور شکار کرنے کی کوئی کوشش کی ؟- اگر ان سوالوں میں سے کسی سوال کا جواب بھی اثبات میں نہیں ہے تو کیا میں مولانا سے عرض کر سکتا ہوں کہ یہ نقرہ محض اس لیے انہوں نے لکھ دیا کہ زبانِ قلم پر "شکاری کمیونسٹوں" کی جو پھبتی آگئی تھی اس کی اپنے ناظرین سے داد لینے کی خواہش کو مولانا دبا نہ سکے !- کیا یہی وہ احتیاط و تقویٰ ہے جس کا مولانا نے اپنے مضمون کے شروع میں حوالہ دیا ہے ؟- کیا واقعی ہم کمیونسٹوں کی طرح کچھ اپنے نظریات رکھتے ہیں جن کا خدا اور رسول کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے اپنے من گھڑت ہیں ؟ کیا سچ مچ ہم بھی کمیونسٹوں کی طرح خلقِ خدا کا شکار کرتے پھر رہے ہیں ؟ کیا واقعی اپنی جماعت سے باہر کسی عالمِ دین یا خادمِ دین کا نہ ہم نے احترام کیا ہے اور نہ اس سے استفادہ کرنا پسند کیا ہے ؟ اور کیا واقعی خود مولانا کے دل میں بھی اپنے گروہ کے سوا کسی دوسرے کے علم و دین کا کوئی احترام موجود ہے جبکہ اپنی تبلیغ کو تو وہ سمجھتے ہیں تبلیغِ دین اور دوسروں کی تبلیغ کو وہ قرار دیتے ہیں شکار ؟

اگر مولانا بُرا نہ مانیں تو مَیں ذرا اُن سے ایک بات اور دریافت کر لوں ؟ وہ یہ کہ آخر آپ حضرات نے خود اپنے آپ کو دوسروں سے استفادہ کرنے کی ضرورت سے کیوں بالاتر سمجھ لیا ہے ؟ اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی خدا کا بندہ دین کے تقاضے سمجھانے یا کوئی صالح لٹریچر پیش کرنے کے خیال سے چلا جائے تو پیشانیوں پر بل آجاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ کمیونسٹوں کی طرح ہمارا شکار کرنے آیا ہے ؟ کیا دوسروں کی صحبت سے یا ان کے لٹریچر سے فائدہ اٹھانا آپ حضرات کے لیے شریعت میں حرام ہے ؟ کیا آپ حضرات اپنے حلقہ سے باہر کسی کو اس کا اہل نہیں پاتے کہ اس سے دین کے تقاضے سمجھیں اور اپنی کمزوریوں کو دور کریں ؟ دوسروں کو جو نصیحت آپ اس شد و مد سے فرماتے ہیں ذرا اپنوں کو بھی تو یہ مفید بات سمجھانے کی کوشش کیجیے !- یہ نسخۂ کیمیا اثر صرف ہمارے ہی لیے اکسیر نہیں ہے، بلکہ آپ حضرات کے لیے بھی ان شاء اللہ نافع رہیگا !- اور کچھ نہیں تو وہ غرورِ نفس ہی کچھ ٹوٹے گا جس کی بنا پر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر

کو آپ کے آستانوں پر استفادہ کے لیے آنا چاہیے مگر آپ کو کہیں استفادہ کے لیے جانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) چوتھا مشورہ یہ ہے کہ دین کے جو اور کام ہیں مثلاً مدارس وغیرہ ان کی تحقیر سے بچا جائے۔

یہ مشورہ بھی ہے تو مشورہ کی شکل میں لیکن دراصل یہ بھی جماعت پر ایک صریح تہمت اور بہتان ہے۔ بظاہر یہ مشورہ پیش کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتی کہ مولانا نے چلتے چلاتے چاہا کہ ایک بدگمانی دینی درسگاہوں کے معلموں اور متعلموں کے دلوں میں بھی پیدا کر دیں کہ جماعت اسلامی والے تمہاری بھی تحقیر کرتے رہتے ہیں۔ جماعت اسلامی دینی مدرسوں کی تو درکنار خانقاہوں کی بھی تحقیر پسند نہیں کرتی۔ ہم سارے نظام تعلیم کو کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں اور جب تک ہمیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو جاتی اس وقت تک جس جگہ بھی دینی تعلیم کی کوئی خدمت ہو رہی ہے ہم اس کی دل سے قدر اور اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ ہمارے پاس جس قسم کے بھی دینی مدارس تھے پاکستان ان سے بھی محروم ہو گیا۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ جب تک ہمارے نصب العین کے مطابق نظام تعلیم میں تبدیلی نہیں ہو جاتی اس وقت تک عارضی طور پر کم از کم ویسی ہی درسگاہیں قائم کی جائیں جو عام معیار کے مولوی ہی پیدا کرتی رہیں۔ اگر دینی تعلیم کے موجودہ نظام پر ہماری طرف سے کچھ کہا گیا ہے تو اس کا مقصد اصلاح کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر کوئی شخص اس کو تحقیر پر محمول کرتا ہے تو یہ اس کے ذہن کی افتاد ہے۔ تحقیر نہ ہمارے پیش نظر کبھی رہی ہے نہ کبھی رہے گی۔

(۵) پانچواں مشورہ مولانا نے یہ دیا ہے کہ لکھنے میں طنز و تعریض اور تحقیر و تذلیل کا وہ رویہ جسے آج کل کے رسالہ نگاروں اور اخبار نویسوں نے بالکل حلال بلکہ کمال سمجھ لیا ہے اس کو یکسر ترک کیا جائے۔

یہ مشورہ بھی جماعت پر ایک تہمت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کا کوئی شخص کبھی اپنے کسی مضمون میں طنز و تعریض کا استعمال بے اعتدالی کے ساتھ کر گزرا ہو۔ لیکن جس شخص نے بھی آج کل

کے رسالہ نگاروں اور اخبار نویسوں کی تحریریں دیکھی ہیں اور اس کے ساتھ، جماعت اسلامی کے اہل قلم کی تحریروں کو بھی پڑھا ہے وہ ایمانداری کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی طرز کے لکھنے والے ہیں۔ آج کل کے اخبار نویس اور رسالہ نگار تو درکنار، میں کہتا ہوں کہ آج کل کے فتویٰ نویس تک، اور وہ فتویٰ نویس جن کی حیثیت محض مفتیانِ کرام ہی کی نہیں بلکہ ماہرینِ تزکیۂ نفس کی بھی ہے، اپنی تحریروں میں اُس احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھتے جو جماعت اسلامی کے معمولی اہل قلم ملحوظ رکھتے ہیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ مولانا کو اعتراض طنز و تعریض کی بے اعتدالی ہی پر ہوگا نہ کہ نفسِ طنز و تعریض پر۔ کیونکہ جہاں تک نفسِ طنز و تعریض کا تعلق ہے اس کے جواز کے ثبوت کے لیے یہ کیا کم ہے کہ اس کی نہایت واضح مثالیں خود مولانا کے اس مضمون ہی میں موجود ہیں جس میں ہم کو طنز و تعریض سے بچتے رہنے کی نصیحت فرمائی گئی ہے۔ میں یہاں مولانا کے چند بے پردہ طنز کی مثالیں پیش کرتا ہوں اور میرا مقصود ان مثالوں کے پیش کرنے سے ہرگز مولانا کو الزامی جواب دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جو لوگ طنز و تعریض اختیار کرنا چاہیں وہ مولانا کی ان معصوم طنزیات کو اپنے لیے نمونہ بنا سکیں۔ جماعت کے لٹریچر پر مولانا ان الفاظ میں طنز فرماتے ہیں:۔

"ابھی تک جماعت کے ذمہ داروں نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی ہے اور" الماریاں بھر دینے والا لٹریچر" بھی ان کے تذکرہ سے خالی ہے"

جماعت کے عام ارکان پر مولانا کی یہ پھبتیاں ملاحظہ ہوں:۔

"آپ حضرات کے اُن سیکڑوں اور ہزاروں متبعین پر جو دین کے ہر شعبہ میں آپ ہی حضرات کو علم و تحقیق کا خاتم سمجھتے ہیں"

"تو آپ کے لٹریچر کے تیار کیے ہوئے بہت سے" محققین" و" مجتہدین" پوری بیباکی کے ساتھ ان کے بدعت و ضلالت اور غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ صادر کر دیں گے"

"لیکن آپ حضرات کے وہ پیرو جنہوں نے اسلام کی روح اور اس کے قالب کے بارے میں

سارا علم آپ حضرات کے مقالات و مضامین ہی سے حاصل کیا ہے۔"

"اردو کے چند رسالے پڑھکر آپ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ دین کا پورا علم آپ کو حاصل ہو گیا ہے۔"

"اور شکاری کمیونسٹوں کی طرح صرف اپنے نظریات کی تبلیغ ہی کے لیے نہیں بلکہ دین و ایمان کے رشتہ سے ـــــ اور استفادہ کی نیت سے ان کی خدمت میں حاضری دی جائے۔"

مَیں نے محض بطورِ مثال یہ چند نمونے پیش کر دیے ہیں۔ مولانا کے مضمون میں اس طرح کی بے حد اور معصومانہ طنزیات کی بہت سی مثالیں مل سکیں گی۔ اہلِ قلم بے دھڑک اُن کی پیروی کر سکتے ہیں۔

(۶) مولانا کا آخری مشورہ یہ ہے کہ عام و خاص مسلمانوں کے ساتھ تعلق و برتاؤ میں وہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے جس پر مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم نے اپنی تبلیغی دعوت میں "اکرامِ مسلم" کے عنوان سے انتہائی زور دیا ہے۔

اس مشورے کی ضرورت مولانا نے کیوں محسوس فرمائی؟ یہ سوال لائقِ غور ہے۔ غالباً مولانا یہ تو نہیں فرما سکتے کہ وہ جماعتِ اسلامی کے لوگوں کو ہر جگہ، ہر محفل اور ہر بازار میں "عام مسلمانوں" کی توہین و تذلیل کرتے دیکھ رہے تھے اس لیے آخر تنگ آ کر انہیں یہ مشفقانہ نصیحت کرنی پڑی۔ اور شاید وہ یہ بھی نہیں فرما سکتے کہ کچھ "خاص مسلمانوں" سے ہم رات دن مار پیٹ اور گالم گلوچ کرنے میں مشغول تھے جسے ناقابلِ برداشت پا کر آخر کار مولانا کو ہم سے یہ کہنا پڑا کہ بھائی، اکرامِ مسلم کا شیوہ اختیار کرو۔ اگر خدانخواستہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات ہو تو مولانا اس کی ضرور نشان دہی فرمائیں۔ ان کی بڑی عنایت ہو گی۔ لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو پھر سوال یہ ہے کہ عام و خاص مسلمانوں کے ساتھ تعلق و برتاؤ میں ہمارا وہ کونسا طرزِ عمل ہے جو مولانا کو "اکرامِ مسلم" کے خلاف نظر آتا ہے، اور خود مولانا کی تبلیغی جماعت کا کیا طرزِ عمل ہے جسے وہ "اکرامِ مسلم" سمجھتی ہے اور ہم سے بھی اس کی پیروی کرانا چاہتی ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ مولانا کو جماعت اسلامی کے اُس طرزِ عمل پر اعتراض ہے جو اس نے فسق و فجور اور اباحیت کے علمبرداروں، اور غیر اسلامی تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے حامیوں پر نکتہ چینی کرنے میں اختیار کیا ہے۔ مولانا اسی نکتہ چینی اور اسی ازکارِ منکر کو اکرام مسلم کے خلاف قرار دے رہے ہیں اور ان کا منشاء یہ ہے کہ جو فسّاق و فجار اور علمبردارانِ بدعت و ضلالت مسلمانوں کے بھیس میں کام کر رہے ہیں، اوّل تو ان سب کی تعظیم و تکریم کرو اور ان کے خلاف زبان کھولو ہی نہیں، اور اگر اس پر تم صبر نہیں کر سکتے تو ان پر علی الاعلان نکیر نہ کرو بلکہ ان کی کوٹھیوں پر حاضری دے کر عاجزی و مسکنت کے ساتھ دست بستہ کچھ خدا رسول کی باتیں عرض کر دیا کرو۔ مولانا کی اپنی جماعت کا رویہ ہندوستان و پاکستان، دونوں جگہ یہی ہے۔ اس نے نہ ہندوستان میں کبھی اُن لوگوں کے خلاف آواز اٹھائی جن کی بدولت وہاں بیدینی کا طوفان اٹھ رہا ہے، اور نہ سے پاکستان میں کبھی یہ توفیق ہوئی کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر یہاں کی قیادتِ فاسقہ کے خلاف قولاً یا عملاً کچھ کرتی۔ اسی وجہ سے یہ جماعت پاکستان میں بھی حکومت اور حکام کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی ہوئی ہے حتیٰ کہ یہاں کے فرمانرواد دل سے یہ چاہتے ہیں کہ "مذہب" کے لیے اگر کچھ کام کیا جائے تو اسی جماعت کے طریقہ پر کیا جائے، اور اسی وجہ سے، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس جماعت کی سرگرمیاں ہندوستان کی حکومت کی نگاہوں میں بھی کبھی نہیں کھٹکیں، کیونکہ بودھ مذہب کے بھکشوؤں کی طرح کام کیا جائے تو اس پر تو چنگیز خانی سلطنت کو بھی کبھی اعتراض نہیں ہوا۔

مولانا کا مشورہ دراصل یہ ہے کہ جماعت اسلامی بھی یہی روش اختیار کرے۔ اسی کا پاکیزہ نام انہوں نے "اکرامِ مسلم" رکھا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ اکرام مسلم ایک نہایت خوفناک فتنہ ہے۔ اس فسق و فجور کی قہرمانی کے زمانہ میں اگر اکرام مسلم کے اس اصول کو رہنما بنا کر کوئی تحریک چلا دی جائے اور وہ تحریک مسلمانوں میں مقبول بھی ہو جائے تو اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ تھوڑے دنوں کے اندر اندر وہ سارا فسق و فجور جو آج برپا ہے، مسلمانوں کی نگاہوں میں مبغوض ہونے کے بجائے، محبوب و محترم بن جائے گا اور آہستہ آہستہ وہ زمانہ آجائیگا کہ اگر کوئی خدا کا بندہ کسی کے فسق و فجور پر نکیر کرے تو

"اکرام مسلم" کے یہ علمبردار اس کی گردن ماردیں۔ اس وجہ سے اُن لوگوں کا یہ اندیشہ کچھ بیجا نہیں ہے جو "اکرام مسلم" کی اس تحریک کو اکرام فساق کا ایک بہانہ سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اس سے نہ صرف مسلمانوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح مردہ ہوجائیگی بلکہ مسلمانوں پر فاسقانہ قیادت کو مسلط رکھنے میں یہ تحریک بہت معین ہوگی۔

میں یہاں چند احادیث نقل کرتا ہوں جن سے یہ معلوم ہوسکے گا کہ اسلامی نظام حیات میں جاہلی نظام زندگی کی آمیزشیں کرنے والوں اور خدا اور رسول کی کھلے بندوں نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کیا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

جو لوگ اسلامی نظام زندگی میں جاہلی نظام زندگی کی آمیزشیں کریں، یعنی اسلام کسی اصول حیات کی ہدایت کرتا ہو اور وہ اس کی جگہ کسی اور اصول حیات کو فروغ دینے کی کوشش کریں، اسلام کسی طرز معاشرت و معیشت کو پسند کرتا ہو اور وہ کسی اور طرز معاشرت و معیشت کو مسلمانوں میں مقبول کرنے کی سعی کریں، اسلام کسی نظام اجتماعی کو پیش کرتا ہو اور وہ کسی اور نظام اجتماعی کے علمبردار بنیں، اُن کے بارے میں نبی کریم صلعم نے "اکرام" کے بجائے ہم کو یہ ہدایات دی ہیں۔

عن عائشۃ عن النبی صلعم انہ قال من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد۔ (بخاری و مسلم)	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ جو ہمارے اس نظام میں وہ چیز گھسا لائے جو اس کے اندر کی نہیں ہے تو وہ اس کے منہ پر پھینک ماری جائے۔

بخاری شریف کی ایک دوسری روایت ہے:۔

عن ابن عباس عن النبی صلعم ابغض الناس الی اللہ ثلاثۃ ملحد فی الحرم و مبتغ فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ	ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑھکر مبغوض تین ہیں ایک وہ جو حرم میں خدا کی نافرمانی کرے۔ دوسرا وہ جو

وَمطلبُ دَمِ امْرِیٍٔ مُسْلِمٍ بِغَیْرِ حَقٍّ لِیُھْرِیْقَ دَمَہٗ ۔

اسلامی نظامِ حیات میں غیر اسلامی طریقے گھسانے کی کوشش کرے۔ تیسرا وہ جو کسی مسلمان کی جان لینے کے ناحق درپے ہو۔

مسلم شریف کی روایت ہے

عن ابن مسعود عن النبی صلعم ثم انما تخلف من بعد هم خلوف یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یومرون فمن جاهدهم بیده فهو مومن ومن جاهدهم بلسانه فهو مومن ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن ولیس وراء ذالک من الایمان حبة خردل (مسلم)

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ پھر اُن کے (یعنی نبی کے اچھے ساتھیوں اور صالحین کے) بعد ایسے لوگ اُن کے جانشین بنتے ہیں جو کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں اور کرتے ہیں وہ جس کا حکم ان کو نہیں دیا گیا، تو جو اُن کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن، جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن، اور جو اُن کے خلاف دل سے جہاد کرے وہ مومن۔ اس سے آگے ایمان کا کوئی ذرہ بھی نہیں ہے۔

پھر ذرا اکرامِ مسلم کے علمبردار حضرات یہ حدیث بھی سنیں:-

عن ابراهیم بن میسرة عن النبی صلعم من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الاسلام (بیہقی)

ابراہیم بن میسرہ سے روایت ہے کہ جس نے اسلامی نظامِ حیات میں غیر اسلامی باتیں گھسانے والے کا احترام (اکرام) کیا اس نے اسلام کو ڈھانے کے کام میں مدد کی۔

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو جس سے فساق و فجار کے احترام و اکرام کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے

اذا امدح الفاسق غضب الرب تعالیٰ واهتزله العرش

جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور عرشِ الٰہی ہل

جاتا ہے۔

ایک اور حدیث ہے :-

لا تقولوا المنافق سید فانہ ان یک سیدًا فقد اسخطتم ربکم۔ کسی منافق کو اپنا لیڈر نہ کہو کیونکہ اگر وہ تمہارا لیڈر ہُوا تو تم نے اپنے خدا کو ناراض کیا۔

مولانا محمد منظور صاحب نے پہلی مرتبہ اپنے اس مضمون کے ذریعہ سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی یہ تبلیغی تحریک حضرت امام حسنؓ کے اتباع پر قائم ہے، اس لیے نامناسب نہ ہوگا، اگر یہاں امام ممدوح کا بھی ایک قول ہم نقل کر دیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

من دعا لظالم بالبقاء فقد احب ان یعصی اللہ فی ارضہ۔ جس نے کسی ظالم کے لیے بقا کی دعا کی اس نے اس بات کو پسند کیا کہ خدا کی زمین میں اس کی نافرمانی ہوتی رہے۔

میں اکرام مسلم کی تحریک چلانے والوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس دور فسق و فجور میں مسلمانوں کو یہ سبق اچھی طرح پڑھا دیا گیا کہ ہر مسلمان کی عزت کرتے رہو خواہ وہ فاسق ہو یا متقی، اور عملاً فساق و فجار کی خوشامد اور اُن کے تملق کی عادت اُن کے اندر پختہ کر دی گئی تو یہ اللہ کے دین کی خدمت ہوگی یا یہ اس کے دین کا ہادم ہوگا؟ دین کے احیاء کی اگر کوئی امید اس غلبۂ فسق کے زمانہ میں ہے تو اسی بات سے ہے کہ ابھی خدا کے فضل سے عامۂ مسلمین کے اندر فساق و فجار کے خلاف کراہت کا جذبہ موجود ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ جذبہ بھی اکرام مسلم کے انجکشن دے دے کر مردہ کر دیا گیا تو کیا اسلام کے احیاء کی کوئی کوشش کارگر ہو سکے گی؟ اور کیا اس عظیم نقصان کی تلافی صرف اتنی بات سے ہو سکے گی کہ کچھ مسلمانوں کو کلمہ کی ہجے یاد ہو گئی!

حیرت ہوتی ہے کہ جو حضرات میلاد اور فاتحہ کرنے والوں کو مبتدع قرار دیتے ہیں اور ان کے خلاف آئے دن جلسے جما جما کر تکفیر کے ہنگامے کھڑے کرتے رہتے ہیں، نہ ان کے ساتھ میل جول کو پسند کرتے نہ ان کے پیچھے اِن کی نمازیں ہی درست ہوتیں، وہ اُن لوگوں کے اکرام و احترام کی تحریک

چلاتے ہیں جو اسلام کے سارے نظامِ حیات کو درہم برہم کر رہے ہیں اور مغربی جاہلیت کے تمام مقاصد کو اسلام کے اندر اسلام کے نام سے گھسا رہے ہیں۔ اُن کی خوشامد اور رضا جوئی کے لیے "اکرامِ مسلم" کی آڑ تلاش کی گئی ہے اور جسارت کا یہ عالم ہے کہ اپنی اس روش پر شرمندہ ہونے کے بجائے اُلٹا ہمیں درس دیا جا رہا ہے کہ فلاحِ دارین کے اس بے ضرر پروگرام کو اختیار کرو۔

مولانا نے اس سلسلہ میں بڑے فخر کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ مصر کی الاخوان المسلمون کے بھی دس میں سے ۹ اصول گویا اسی اکرامِ مسلم کے ضابطہ کی تفصیل و تشریح ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر مولانا کی اس رائے کا علم اخوان المسلمون کو ہو جائے تو وہ غریب اپنے سر پیٹ لیں گے۔ اس لیے کہ اس سے زیادہ سنگین تہمت شاید ان کے اوپر کوئی اور نہیں لگائی جا سکتی۔ ان کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ مصر کی موجودہ فاسقانہ قیادت سے بڑی جرأت کے ساتھ کشمکش کر رہے ہیں اور اس کو تبدیل کرنے کے لیے پوری شدت کے ساتھ عوام میں فسق اور اتباعِ کتاب و سنت کا فرق و امتیاز پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ مولانا کی تبلیغی جماعت کی طرح اکرامِ مسلم کے بہانے اعزازِ فسق اور توقیرِ اصحابِ بدعت کا وعظ کرتے پھر رہے ہیں، مولانا کی بڑی زیادتی ہے۔ اخوان المسلمون کا تصورِ اسلام خدا کے فضل سے مولویانہ و صوفیانہ نہیں ہے۔ وہ اسلام کو بحیثیت ایک ہمہ گیر نظامِ حیات کے پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اپنی قوم کے اُن لوگوں کو مجرم سمجھتے ہیں جو جاہلیت کے اصولوں پر زندگی کا نظام چلا رہے ہیں، اس لیے وہ صرف اکرامِ مسلم کا وعظ نہیں کہتے پھرتے بلکہ اللہ کے دین کو زندگی کے ہر شعبے میں قائم کرنے کے لیے قیادتِ فاسقہ کے خلاف منظم جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو اُسی بات کی دعوت دے رہے ہیں جس بات کی دعوت ہم دے رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم کے لیڈروں سے وہی مطالبے کر رہے ہیں جو ہم اپنی قوم کے لیڈروں سے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اہلِ ملک کے تمام سیاسی مطالبات میں بھی پیش پیش ہیں۔ فلسطین کے جہاد کے سلسلہ میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیے وہ واقفینِ حال سے مخفی نہیں ہیں۔ مصر و سوڈان کے الحاق کی تحریک، علاقہ سویز سے برطانوی افواج کے انخلاء کا مطالبہ، ۳۶ء کے معاہدے کی

منسوخی کا مطالبہ، غرض مصر کی سیاسی و اجتماعی زندگی کا کوئی مسئلہ آج ایسا نہیں ہے جس میں اخوان المسلمون (آپ لوگوں کی اصطلاح خاص میں) اپنی ٹانگ نہ اڑا رہے ہوں، نہایت ہی غلط بتایا ہے جس نے مولانا کو یہ بتایا ہے کہ اخوان المسلمون کلمہ کے پیچھے اور اکرام مسلم کا وعظ کرتے پھر رہے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے ہیں میری نظر سے اس جماعت کا ایک اخبار گذرا۔ اُس میں اس نے اموی خلیفہ سلیمان ابن عبد الملک اور ابو حازم کی مشہور گفتگو نقل کر کے اُن لوگوں کو شرم دلائی تھی جو اکرام مسلم کے بہانے فساق سے تملق کی باتیں کرتے ہیں۔

مولانا نے بڑے ہی عارفانہ انداز میں اس عجیب و غریب اصول کی روحانی برکتوں کا حوالہ دیا ہے اور ازراہ نوازش اُس کی برکات پر ایک مقالہ بھی لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہمیں اس کی روحانی برکتوں کا تو پتہ نہیں ہے، لیکن اُس کی مادی برکتوں کا ہم کو پورا یقین ہے۔ تاریخ بھی شاہد ہے اور ہمارا آج کا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ اس اصول پر "مذہب" کی تبلیغ فسق و جاہلیت کے علمبرداروں کو کبھی ناگوار نہیں ہوئی، بلکہ بارہا انہوں نے خود ایسی تبلیغ کی سرپرستی کی ہے۔

(بقیہ اشارات) پائی جاتی ہیں۔ اس خلجان سے میں نے اپنے کسی رفیق کو بھی خالی نہیں پایا ہے اور میں خود بھی اس سے خالی نہیں ہوں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خلجان ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خامیاں دور کرنے پر اکساتا ہے اور ان صحیح ذرائع و وسائل کی تلاش اور ان کے استعمال پر آمادہ کرتا ہے جن سے یہ خامیاں دور ہوں، تو مبارک ہے یہ خلجان۔ اسے مٹنا نہیں اور بڑھنا چاہیے کیونکہ ہماری ساری اخلاقی و روحانی ترقی کا انحصار اسی خلجان کی پیدا کی ہوئی خلش پر ہے۔ جس روز یہ مٹا اور ہم اپنی جگہ مطمئن ہو گئے کہ جو کچھ ہمیں بننا چاہیے تھا وہ ہم بن چکے ہیں، اسی روز ہماری ترقی بند ہو جائیگی اور ہمارا تنزل شروع ہو جائیگا۔ لیکن اگر یہ خلجان ہمیں مایوسی اور فرار پر آمادہ کرتا ہو تو یہ خلجان نہیں وسوسۂ شیطان ہے۔ جب بھی اس کی کھٹک محسوس ہو لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھیے اور اپنے کام میں لگ جائیے۔ اگر آپ واقعی خدا کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خوب سمجھ لیجیے کہ ایسے وساوس سے اپنے دل کو فارغ کیے بغیر آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس وقت شیطان کے لیے اس سے زیادہ مرغوب کوئی کام نہیں ہے کہ آپ کے سامنے جماعت اسلامی کی ہر خوبی کو بے قدر اور بے وزن کر کے پیش کرے اور اس کی یا اس کے افراد کی ہر کمزوری کو بڑھا چڑھا کر دکھائے تاکہ ۴

۴۔ آپ کسی نہ کسی طرح اس کو چھوڑ بیٹھیں ۔۳